تلخیاں

ساحر لدھیانوی

نیا ادارہ • لاہور

طبع سوم
قیمت :- اڑھائی روپے

پبلشر :- نذیر چودھری آف نیا ادارہ ۔ لاہور
پرنٹر : ضمیر غوری آف گیلانی پریس ۔ لاہور

ترتیب

(طبع ثانی)

انسان کی شدتِ احساس نے شاعری کو جنم دیا۔ تفکّر کی گہرائی نے اسے پروان چڑھایا صوتی آہنگ نے اسے شبابِ جاوداں بخشا اور مشاہدے کی ہمہ گیری نیز ماحول کی اثر آفرینی نے اس میں رنگ بھرے، آپ زمانۂ حال سے صدیوں پیچھے چلے جائیں یا قرنوں آگے نکل جائیں، آپ کو ہر زمانہ کی شاعری میں یہی سلسلہ نمایاں نظر آئے گا۔ اور غور سے دیکھا جائے، تو جملہ فنونِ لطیفہ اسی مختصر سے سلسلہ کی تخلیقات معلوم ہوتے ہیں، شاعری بھی نقادوں کی گھڑی ہوئی اصطلاحات کی محتاج نہیں رہی، ہیئت کے بیشمار نمونے رائج ہوئے اور نابید ہو گئے، لیکن اگر کوئی چیز قائم دائم رہی، تو وہ شدتِ احساس، تفکّر کی گہرائی، صوتی آہنگ، مشاہدے کی ہمہ گیری اور ماحول کی اثر آفرینی ہے،

اس مختصر سی تمہید کا مقصد محض یہ ہے، کہ ساحر کی شاعری میں جن خصوصیات نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا، ان میں احساس کی شدت بہت نمایاں ہے، اور چونکہ ساحر کے فن کی بنیادیں صالح اور خلوص بھرے احساس پر استوار ہیں، اس لئے اس کے ہر شعر میں تفکّر آہنگ، مشاہدہ اور ماحول کے اثرات موجود ہیں، اور انہیں کے باعث وہ دورِ جدید کے نوجوان شعراء میں ایک ممتاز حیثیت کا مالک ہے،

اردو شاعری کے موجودہ دَور کو اکثر نقادوں نے تجرباتی دور کہا ہے تجربہ کی افادیت سے

مجھے انکار نہیں، کیونکہ بعض تجربات اٹل صداقتیں بن جاتے ہیں، اور دنیا مدتوں تک ان کے سہارے چلتی رہتی ہے، حقیقت میں جدید تہذیب کا یہ عروج بھی مختلف قسم کے تجربات کی ایک کڑی ہے، اور اگر ہر تجربے کو اپنایا جائے، تو عین ممکن ہے، کہ عروج کا یہ سلسلہ کہیں ختم ہی نہ ہو، اور امکانات کے دائرے وسیع تر ہوتے چلے جائیں، دراصل اس ضمن میں سب سے خطرناک مسئلہ نامکمل تجربات کا تسلسل ہے، یہ مسلّمہ حقیقت ہے، کہ گزشتہ دس پندرہ برس میں بے شمار تجربات کئے گئے، نظم کی نئی نئی ہیئتیں نکالی گئیں، کسی نے ماضی کی روایات سے علی الاعلان بغاوت کر دی، کسی نے معمولی سی تبدیلی پر اکتفا کی، کوئی نظم کی پرانی صورتوں میں نیا مواد پیش کرنے میں کوشاں رہا، کسی نے نفسیاتی معموں کو معمول ہی میں نظم کر ڈالا، کسی نے جنسی ترغیبات کے کھلم کھلا ذکر سے گھبرا کر انتہا درجہ کے مبہم استعاروں کی پناہ لی، الغرض بیشمار ہیئتیں بدلے گئے اور بدلے جا رہے ہیں، لیکن کسی تجربہ نے صداقت کی صورت اختیار نہ کی، بلکہ ہر تجربہ مزید تجربات کے بوجھ تلے بودا اور پوچ ہوتا گیا، اور آج کل یہ حالت ہے کہ اُردو شاعری کا ہیئتی نظام افراتفری کے عالم میں ہے، دورِ جدید کے چند ممتاز شعرا کا کلام دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے یہ تمام حضرات ایک ہی مرکز سے وابستہ ہیں، مگر ان کی منزلیں بلکہ راہیں تک معیّن نہیں، نصب العین کا فقدان ہے، اور وہ شاعری جس نے جمہور کی بیداری کا بیڑا اٹھایا تھا، ابہام اور بے راہروی کا ایک طومار بن کر رہ گئی ہے، جب تجربات کا یہ عالم ہو، تو ضروری امر ہے، کہ گزشتہ دور کی صورتوں میں حسبِ ضرورت تبدیلیوں کے بعد چند ہیئتیں معیّن کر لی جائیں، کیونکہ تعیین ترقی کی کلید ہے، اور ہر تعیین مستقبل میں ایک نئے تجربہ کا ذریعہ بن سکتی ہے، ساتھ ہی یہ امر بھی قابلِ غور ہے، کہ نئی نئی ہیئتوں کے جنون میں کئی شعرا نے معنی کو پس پشت ڈال دیا ہے، حالانکہ ادب میں ہر نوع کا اجتہاد سب سے اوّل معنی سے شروع ہونا چاہئے،

معنی یا مواد یا موضوع کے مقابلہ میں ہیئت فروعی حیثیت رکھتی ہے اور اگر کہنے والے کا احساس پختہ اور تخیل صاف ستھرا اور بلند ہے تو معنی خود بخود اپنی پسند کی ہیئت میں جلوہ گر ہوتے رہیں گے،

نظم کی جدید سے جدید تر صورتیں صرف اس لئے ایجاد کی جاتی ہیں کہ شاعر کی قوتِ بیان کسی قسم کی رکاوٹ محسوس نہ کرے اور موضوع کے جو نشیب و فراز، تاثرات اور نتائج اس کے ذہن میں محفوظ ہیں، وہ براہِ راست پڑھنے والے کے دل میں اتر جائیں، لیکن اردو شاعری میں ہیئتی انقلاب نے (گنتی کی مستثنیات کو چھوڑ کر) اکثر ایسے شاعر پیدا کئے ہیں، جنہوں نے کسی سے فرائڈ کے چند تجربات اور ان کی نفسیاتی تاویلوں کا ذکر سن لیا ہے، اور وہ اپنے ہر ذہنی پلٹے، اپنی ہر جسمانی امنگ، اپنی ہر جنسی بیقراری کو سنی سنائی نفسیات کے گورکھ دھندے میں پھنسا کر اسی پھنسی پھنسائی حالت میں عوام کے سامنے پیش کر دیتے ہیں، ان شعرا کی انتہا درجہ کی مبہم نظموں نے جدید اردو شاعری میں ایسا طوفانِ بے تمیزی برپا کر رکھا ہے، کہ اب شاعری بچوں کا کھیل سمجھی جانے لگی ہے مصرعوں کو کتر کر، توڑ موڑ کر، کھینچ تان کر، دبا کر، پھیلا کر یا قوافی سے چھٹکارا حاصل کر کے چند الفاظ میں ایک دور از کار موضوع پیش کیا جاتا ہے اس دعوے کے ساتھ کہ اگر ہماری شاعری مبہم ہے، تو صرف اس لئے کہ ہمارا ماحول مبہم ہے، ہمارا مذہب، ہمارا قانون، ہماری سماج، ہماری حکومت ـــــ سب کچھ ابہام ہی ابہام ہے، اور انسان چونکہ سماج اور مذہب سے ابھی تک پیچھا نہیں چھڑا سکا، اور شاعر بھی انسان ہے اس لئے شاعر کا مبہم ہونا حیرت انگیز نہیں، ـــــ کم از کم میرے نزدیک جدید شاعری میں بیشتر نظموں کے ابہام کی یہ تاویل قطعی طور پر طفلانہ انداز کی ہے، اگر شاعر ابہام سے پیچھا نہیں چھڑا سکا، اگر اس کے اشعار پڑھنے سے قاری کو دقت محسوس ہوتی ہے، تو وہ شاعری ہی کیوں کرتا ہے، اگر وہ سماجی اور قانونی دھندلکوں میں اس حد تک کھو چکا ہے، کہ محض اپنی مجبوریوں کے قصّے کو موضوعِ شاعری بنانے

پرتل گیا ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی فنی قوتیں محدود ہیں۔

ان جملہ معروضات کے علاوہ ایک اور "ادبی فیشن" نے اردو شاعری میں بہت عروج حاصل کیا ہے اور وہ ہنگامی شاعری ہے جو جوش ملیح آبادی کی انقلابی نظموں کی اشاعت کے بعد اس صنف کی ابتدا ہوئی، اور تمام ہندوستانی خاص کر صوبجات متحدہ میں اس گرجتی اور دھاڑتی ہوئی شاعری نے وہ عروج پکڑا، کہ اچھے اچھے سخنور اس کی رو میں بہہ گئے، آج بھی جب کہ یہ سستی شاعری کافی حد تک زوال پذیر ہو چکی ہے ہندوستان کے کسی نہ کسی گوشے سے اس "توڑ پھوڑ"، کا نعرہ سنائی دے جاتا ہے لیکن جدید شعرا کے صاحب نظر طبقہ نے جس فکری شاعری کو رواج دیا ہے وہ اب ان دغدغوں اور غلغلوں کو بہت دیر تک زندہ نہیں رہنے دے گی، اگر یہ شاعری کسی ڈھب پر چلتی، افراط تفریط کے نازک خطوط کو دیکھ سکتی، اور صرف جوش کی تقلید ہی کو کعبۂ مقصود نہ بناتی، تو اسے برداشت کیا جا سکتا تھا، مگر مصیبت یہ تھی، کہ ان شعرا نے صرف جوش کو دیکھا، وہ جوش کی انفرادیت، زور بیان اور شدت احساس کو نہ دیکھ سکے، اور اس لئے چند قیمتی برس اس سطحی شاعری میں گنوا دیئے

نئی تعلیم، نئے تجربے اور نئے زاویے اگر ایک نئی اور شاداب زندگی کے حصول میں ہمارے ممد ثابت ہوں تو ان کی ترقی، ترویج اور عروج پہ کون کافر مسرور نہ ہوگا لیکن اگر ہر نیا تجربہ نئی بدعت اپنے ہمراہ لائے، تو اسے ایک لمحے کے لئے بھی برداشت نہیں کیا جا سکتا، اردو ادب کا جدید دور بیشمار خوبیوں اور بہت سی بدعتوں کا ایک مرکب ہے، لیکن مدتوں کی محکومی سے ہماری قوتیں اتنی شل ہو چکی ہیں، کہ ہم خوبی اور بدعت میں امتیاز نہیں کر سکتے۔ اور اگر کوئی ننھا سا امتیاز محسوس بھی ہوتا ہے تو قانون یا پریس یا سماج کے خوف کے مارے ذہنوں ہی میں گھٹ کر نابود ہو جاتا ہے عجیب و غریب استعاروں میں ناگفتہ بہ جنسی حرکات کی تفصیلیں نہایت بھونڈی تمثیلوں میں جنگ پر اظہار خیال — اور ابہام کی وہ شدت کہ اگر خود شاعر نظم کا مطلب نہ سمجھائے تو پڑھنے والے اس

بھول بھلیاں میں مرتے دم تک سر ٹپختے رہ جائیں، ساتھ ہی سطحی شاعری کا فروغ، اردو زبان کی پاکیزگی سے علی الاعلان بے پروائی، یہ اور اس قسم کی ان گنت دوسری بدعتیں اردو شاعری میں فروغ پا چکی ہیں، لیکن مقام شکر ہے کہ چند شعراء جن کی انفرادیت زندہ ہے، اور جو صرف اپنے دماغ سے سوچتے ہیں، اردو شاعری کی ٹوٹی پھوٹی کشتی کو سہارا دیئے چلے جا رہے ہیں، اور ان شعراء میں ہمارا نیا مگر پختہ کار شاعر ساحر بھی شامل ہے،

ساحر نے ہئیت کے معاملہ میں کسی قسم کا اجتہاد نہیں کیا، اس کی بیشتر نظمیں پابند ہیں، اور اگر کوئی ایک آدھ نظم اس پابندی سے آزاد بھی ہے، تو اس کے پڑھنے سے فوراً اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس نظم کا شاعر قافیہ اور ردیف کے حسن اور ترنم کا قائل ہے، ساحر نے ہئیت کے بجائے معنی اور موضوع اور سب سے زیادہ اندازِ بیان میں اجتہاد کیا ہے، جس طرح میں پہلے عرض کر چکا ہوں اس کی شاعری کی بنیاد شدتِ احساس پر ہے، اور میرے خیال میں اس کے اسلوب کا حسن بھی شدید احساس ہی سے عبارت ہے، ساتھ ہی اسے ابہام سے کوئی واسطہ نہیں، وہ خود ایک جگہ کہتا ہے

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں

جو کچھ مجھے دیا ہے، وہ لوٹا رہا ہوں میں

اور ذاتی تجربات و حوادث کا ابہام سے کوئی تعلق نہیں، ابہام صرف وہیں پیدا ہوتا ہے، جہاں ذاتی تجربات کا فقدان ہو، اور کتابی علم موضوعِ شاعری ہو۔

ساحر کی شاعری آج کی شاعری ہے، اس کے تین ادوار مقرر کیے جا سکتے ہیں، رومان — حقیقت —— اور رومان! —— پہلا رومان ابتدائے شباب کا کوئی سانحہ معلوم ہوتا ہے اس کے بعد حقیقت کا دور ہے، جس پر مارکسی تعلیمات کا اثر بہت نمایاں ہے تیسرا دور بھی کسی رومان ہی سے وابستہ معلوم ہوتا ہے لیکن اس میں نئی قسم کی اٹھان ہے، جو پہلے رومانی دور سے قطعاً

مختلف ہے آخری دور کی یہ رومانی کیفیت ابھی عروج تک نہیں پہنچی، اور ساحر حقیقت اور رومان کے دوراہے پر کھڑا زندگی کی ہر لحظہ بدلتی ہوئی اقدار کا جائزہ لے رہا ہے، اور میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ وہ رومان کی راہ پر چلنے کا ارادہ کر چکا ہے، یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ راہ کب اس راہ سے جا کر مل جائے جس نے اس کی شاعری کے دوسرے دور میں اس کے کلام میں تلخی اور تیزی سی بھر دی تھی، البتہ یہ صاف ظاہر ہے کہ وہ دوسری راہ سے نفرت نہیں کرتا بلکہ اس نے صرف ایک جذباتی افتاد کے زیر اثر رومانی راہ اختیار کر لی ہے، وہ چاہے بھی تو حقیقت سے دامن نہیں چھڑا سکتا، وہ حقیقت جو اس نے مارکس اور اس کے عظیم المرتبت جانشینوں کی تعلیمات سے اخذ کی، اور جس کو فن کے سانچے میں ڈھال کر واضح تر کر دینا اس کا مقصد حیات ہے،

دنیا کی ہر زبان کے ادب عالیہ کا موضوع عموماً محبت رہا ہے، اور اگر غور سے دیکھا جائے تو صرف ادب ہی نہیں، بلکہ ہماری زندگی کا نظام کسی نہ کسی محبت کا مرہونِ منّت ہے، اور جنسی محبت ان سب میں ممتاز اور نمایاں رہی ہے، ابتدائے محبت کی مدہوش کن رنگینیاں ہر سچے شاعر کے ابتدائی کلام میں موجود ہوتی ہیں، لیکن یہ دیکھ کر ہمیں تعجب ہوتا ہے کہ ساحر شروع ہی سے محبت کی تلخیوں کا قصہ چھیڑ دیتا ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ وہ بہت مدت تک رومان کے دھندلکوں میں نہیں رہا، اور حقائق کے ان کھلے میدانوں میں نکل آیا ہے، جہاں قدم قدم پر خلافِ فطرت معاشرتی مفروضوں اور خود ساختہ اخلاقی معیاروں سے مڈبھیڑ ہوتی ہے، اور اگر احساس زندہ ہو تو جنگ بھی ہوتی ہے اور ریاست، معاشرت اور مذہب کی کہنہ اقدار کے ملبے سے نئی جاندار اور پائندہ اقدار کا خمیر اٹھانا پڑتا ہے،

جوانی اور محبت کے ابتدائی دور میں ہر شاعر عشق و محبت کی رنگینیوں اور سرشاریوں کے گیت گاتا ہے، یہ ناممکن ہے کہ ساحر ابتدا ہی سے محبت کی انتہائی تلخیوں کی ترجمانی کرنے لگا ہو، لیکن اس

حقیقت سے انکار مشکل ہے کہ ہمارے نوجوان طبقہ کے "معمول" کے خلاف ساحر کی ذہانت بہت تیزی سے ابھر آئی، اور اسے ایک ایسا شعر کہنا پڑا، جو صرف ایک جہاندیدہ اور بہت تجربہ کار شاعر ہی کہہ سکتا تھا:-

ابھی نہ چھیڑ محبت کے گیت اے مطرب ابھی حیات کا ماحول خوشگوار نہیں

اور ماحول کی ناسازگاری کا باعث سوائے موجودہ نوکر شاہی، سرمایہ داری اور اجنبی حکومت کے اور کیا ہو سکتا ہے،

ساحر کی محبت ایک سرکش کی محبت ہے، وہ محبت جو بورژوا طبقے کی بیشمار اور نفرت انگیز حدبندیوں کی وجہ سے پنپ نہ سکی، اور وہ اپنی محبت کی شدت اور اپنی محبوبہ کی بے بسی سے متاثر ہو کر حقائق حیات کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے پر مجبور ہو گیا، میں اسے مجبوری ہی کہوں گا، کیونکہ انسانی جبلت میں فوری انقلاب ناممکن ہے بشرطیکہ وہ کسی سخت مجبوری کا مرہون منت نہ ہو، اسکی ابتدائی نظموں میں بار بار مایوسیوں اور مجبوریوں کی تہوں کے نیچے سے تجدید محبت کا ہنگامہ بلند ہوتا ہے لیکن تلخیوں نے اس کے ذہن کو اس شدت سے محصور کر رکھا ہے، کہ وہ کسی سہارے پر بھروسہ نہیں کر سکتا اور پکارتا ہے:-

میری محبوب، یہ ہنگامۂ تجدید وفا میری افسردہ جوانی کے لئے راس نہیں

میں نے جو پھول چنے تھے تیرے قدموں کے لئے ان کا دھندلا سا تصور بھی مرے پاس نہیں

اس نفسیاتی تسلسل کی دوسری کڑی ساحر کی فکری شاعری ہے، جب محبت کا انجام سوچ ہو تو ضروری امر ہے، کہ محبت فروعی حیثیت اختیار کر کے پیچھے ہٹ جائے، اور زندگی کے دیگر بیشمار بندھنوں سے سابقہ پڑے، دوسرے دور کی نظموں میں وہ اکثر کھویا کھویا اور سوچتا ہوا معلوم ہوتا ہے، سب سے اوّل وہ محبت کے متعلق سوچتا ہے، لیکن جب اپنے ذہنی انقلاب کی روشنی میں اسے پرکھتا ہے تو یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے۔

سوچتا ہوں کہ محبت ہے جنونِ رسوا　　چند بیکار سے بیہودہ خیالوں کا ہجوم

اگرچہ اسے اقرار ہے کہ :-

وہی شعلے مرے سینے میں نہاں ہیں اب تک

لیکن ساحر کے تجربات نہایت تلخ ہیں، اس لیئے وہ عشق و محبت کے پوشیدہ شعلوں کو بھڑکانے کی کوشش نہیں کرتا، بلکہ یہ کہہ کر انہیں ایک حد تک بجھا دیتا ہے :-

آہ اس کشمکش صبح و مسا کا انجام　　میں بھی ناکام مری سعیٔ عمل بھی ناکام

یہاں سے آگے ساحر کی نظموں میں عشق و محبت کا ذکر گھٹا ٹوپ اندھیرے میں کوندے کی طرح چمک کر غائب ہو جاتا ہے اور مارکس کے ایک مخلص مرید کی طرح "تمہارے غم کے سوا اور بھی تو غم ہیں مجھے" کہہ کر ایک اور راہ اختیار کر لیتا ہے جہاں قدم قدم پر اسے بھوکے بھکاری، افلاس، انسانیت کی آہ و بکا، کارخانوں میں لوہے کے شور، بے کفن لاشوں، زرد رو بچوں، بکتے ہوئے جواں جہموں، قانون کی گرفت، محکومی اور سب سے زیادہ جاگیردارانہ نظام کی غلط تقسیم سے نبٹنا پڑتا ہے اور چونکہ اس کا احساس پختہ اور صیقل ہے اس لیئے اس کے مشاہدہ میں گہرائی اور اس کے اسلوب میں توازن ہے

اس سے قبل ایک "ادبی فیشن" کے متعلق ذکر کیا جا چکا ہے بھوک، مزدور، غلامی اس فیشن کے محور ہیں، چیخ دھاڑ اور واویلا اس فیشن کا طرۂ امتیاز ہے اور بیشمار نوجوان شعراء کے لیئے یہ فیشن بہت مدت تک سستی شہرت حاصل کرنے کا ذریعہ بنا رہا ہے یہ مسلّمہ حقیقت ہے کہ جدید ہندوستان میں شاعری کا موضوع صرف محبت نہیں رہا، صدیوں کی غلامی کے بعد سیاسی بیداری فنونِ لطیفہ کی ہر شاخ پر اثر انداز ہوئی ہے اور شاعری، جسے حقیقت کی ترجمانی کا دعویٰ ہے اس خوش آیند تغیر سے بہت زیادہ متاثر ہوئی ہے لیکن ماحول کی عکاسی اور پراپیگنڈا میں بہت بڑا فرق ہے ساحر کی دوسرے دور کی نظمیں پڑھتے چلے جایئے، آپ کو بہت کم مقامات ایسے ملیں گے، جہاں

اس نے فن کو جذباتیت پر قربان کر دیا ہو۔ اس کی ان نظموں میں بے پناہ خلوص ہے، وہ جو کچھ محسوس کرتا ہے، وہی کہتا ہے اور جو کچھ اس انداز سے کہتا ہے کہ اس کی نظموں کا تاثر پڑھنے والے کے احساسات میں ایک کرب آمیز جھنجھناہٹ پیدا کرتا ہے، اسے بہت دیر تک سوچتا چھوڑ جاتا ہے، ان نظموں میں ساحر کی انفرادیت اس قدر نمایاں ہے کہ ہمیں اس کے ایک ایک شعر سے ایک نئے دکھ۔ ایک نئے زاویے اور ایک نئی صبح کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

تشکیک جو زمانۂ حال کے ہر نوجوان کو ورثہ میں ملی ہے اور جس سے بالخصوص ہم ہندوستانیوں کو مفر نہیں ساحر کی نظموں میں بھی موجود ہے۔ "سوچتا ہوں"۔ "ناکامی"۔ "مجھے سوچنے دے" اور "گریز" وغیرہ میں ساحر نے اپنے اردگرد پھیلی ہوئی ہولناک ظلمتوں سے نکل جانے کی بہت کوشش کی ہے، لیکن اس کی رُوح مضمحل ہے، اس کی قوتیں شل ہیں، اس کے حوصلے مذبذب ہیں، اور جب کبھی اپنے وطن کی ذلت، مجبوری اور غلامی کو دیکھتا ہے تو نہایت اداس لہجے میں صرف اتنا کہتا ہے :۔

"یہ غم بہت ہیں میری زندگی مٹانے کو"

اور :۔

"مایوسیوں نے چھین لئے دل کے ولولے"

اور :۔

"میرے بے چین خیالوں کو سکوں مل نہ سکا"

اور :۔

"جو سچ کہوں تو مجھے موت ناگوار نہیں"

"گریز" میں تذبذب اور تشکیک اپنے عروج پر ہیں۔ اس نظم کے ابتدائی حصے میں وہ اپنی محبت کی ناکامیوں کا فنکارانہ ذکر کرنے کے بعد جب یہ کہتا ہے :۔

"میں زندگی کے حقائق سے بھاگ آیا تھا کہ مجھ کو خود میں چھپا لے تری فسوں زائی"

تو اس کا تذبذب اسے یہاں بھی چین نہیں لینے دیتا۔ حقائق یہاں بھی اس کا تعاقب کرتے ہیں (اور یہ شعر کتنا بے مثال اور مکمّل ہے) :-

"ہر ایک ہاتھ میں لے کر ہزار آئینے حیات بند دریچوں سے بھی گزر آئی"

تو وہ گھبرا جاتا ہے اور غیض و غضب کے عالم میں فنی لطافتوں سے ایک حد تک گریز کر جاتا ہے :-

"وہ پھر کسانوں کے مجمع پہ گن مشینوں سے حقوق یافتہ طبقے نے آگ برسائی"

یہ شعر شاعر کے ذہنی خلفشار کی ایک مثال ہے۔

میری رائے میں "گریز" ساحر کی نظموں میں کئی لحاظ سے ممتاز نظم ہے، یہ موجودہ دور کے ایک تعلیم یافتہ نوجوان کے شکست خوردہ ارادوں اور پامال امنگوں کا ایک مرقع ہے، اس میں بہت بلند درجہ کے اشعار بھی ہیں اور کم درجہ کے بھی مختلف قسم کے خیالات کا ایک ہجوم ہے۔ جن میں تسلسل ہے بھی اور نہیں بھی۔ آخری شعر ایک متشکک کے ذہن کا کتنا صاف آئینہ ہے :-

"مرا جنونِ وفا ہے زوال آمادہ شکست ہو گیا۔ تیرا فسونِ زیبائی"

دوسرے دور کی آخری نظموں میں ساحر بہت سی ذہنی پیچیدگیوں سے آزاد ہو گیا ہے، "طرحِ نو" "تاج محل"، "لمحۂ غنیمت"، "اجنبی محافظ"، "شاہراہِ فردا" اور "شہزادے" اس دور کی بہترین نظمیں ہیں۔ اب ساحر کا آدرش بالکل واضح ہے اس کا مقصد معیّن ہے۔ اور اس کے اسلوب میں وسعت اور پختگی ہے۔ داخلی الجھنوں کے بجائے اب وہ خارجی دنیا کی بیکرانی کو دیکھتا ہے، اس کی تاریخی حس بیدار ہوتی ہے، مستقبل کی دھندلاہٹیں چھٹ جاتی ہیں، اور وہ زمانۂ حال کی سیاسی، سماجی اور اقتصادی کشمکش کا ایک علاج بھی سوچ لیتا ہے، اس نفسیاتی آراستگی کے باعث تذبذب یک قلم ناپید ہو جاتا ہے،

فرصتِ یک نفس غنیمت جان

اُٹھو اے مظلوم انسانو

ایک نیا سورج چمکا ہے ، ایک انوکھی ضو باری ہے
ان الفاظ میں یقین کی پختگی اور امید کی روشنی ہے ،

ساحر کی شاعری کا آخری (یعنی موجودہ) دور نفسیاتی لحاظ سے بہت سی الجھنوں کا حامل ہے اس کی تازہ نظمیں "بنگال"، "فن کار"، "کل اور آج" آسانی سے دوسرے دور میں شامل کی جا سکتی ہیں، لیکن "ہراس" اور "اسی دوراہے پر" میں داخلیت کا عنصر اتنا شدید ہے کہ یہ دور ساحر کی شاعری کے پہلے دو ادوار سے قطعی طور پر الگ کیا جا سکتا ہے، یہ نظمیں ایک سنبھلے ہوئے انسان کی ذہنیت کے مرقعے ہیں، جس نے محبت کے مدوجزر اور زندگی کے دیگر نشیب و فراز کا نہایت گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے، ساحر کا یہ فکری پلٹا ایک حد تک حیرت انگیز سہی، لیکن غیر فطری نہیں، ایک نئے ماحول میں قدم دھرتے ہی اس نے اپنے آپ کو نئے رنگوں میں پیش کرنا شروع کر دیا ہے جہاں تک میرا خیال ہے ساحر کا یہ پلٹا وقتی اور اضافی ہے، اور اس کے سیاسی، تاریخی اور معاشرتی نظریئے اتنے صاف اور معین ہیں، کہ وہ ان "فروعات" کی طرف کسی جذباتی افتاد کے زیر اثر مائل ہونے کے باوجود اپنے ذہنی مرکز سے کبھی جدا نہیں ہو سکے گا ،

لیکن "ہراس" اور "اسی دوراہے پر" فنی لحاظ سے اتنی مکمل اور حسین نظمیں ہیں، کہ جی چاہتا ہے، ساحر کچھ عرصہ کے لئے اسی راہ پر گامزن رہے اور اردو کی رومانی شاعری میں نت نئے اور خوبصورت اضافے کرتا جائے، ان نظموں میں وہ جھجکتے اور رکتے ہوئے اظہار محبت کرتا ہے

کیونکہ وہ موجودہ نظام میں محبت کی زبوں انجامی سے اچھی طرح آگاہ ہے،

میں سلگتے ہوئے رازوں کو عیاں تو کر دوں لیکن ان رازوں کی تشہیر سے جی ڈرتا ہے

اس ڈر کی وجہ محض یہ ہے کہ :-

میں ترے شہر میں انجان ہوں، پردیسی ہوں

"اسی دوراہے پر" کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خود شاعر بھی اس ذہنی انقلاب سے باخبر ہے، وہ جانتا ہے کہ محبت کا پنپنا محال ہے، لیکن ہائے انسان کی بے بسی :-

تیری چپ چاپ نگاہوں کو سلگتے پا کر میری بیزار طبیعت کو بھی پیار آ ہی گیا

ساحر ایک منزل پر پہنچ چکا تھا جہاں سے مستقبل کا افق درخشاں و تاباں نظر آرہا تھا، لیکن اسی منزل کے کسی چپ چاپ کنج کی مدہوش کن رنگینی نے اسے مسحور کر لیا ہے، اور اگرچہ وہ اپنے اس عزم کو فراموش نہیں کر سکا کہ :-

اب نہ ان اونچے مکانوں میں قدم رکھوں گا

لیکن :-

تیرے سانسوں کی تھکن، تیری نگاہوں کا سکوت

اور :-

تیرے پیراہنِ رنگیں کی جنوں خیز مہک

— ان سحروں سے وہ چاہے بھی تو بیگانہ نہیں ہو سکتا۔ اور میری تمنا ہے کہ یہ رومانی سرشاری اور وہ سیاسی بیداری اچھی طرح گھل مل جائیں، تاکہ جب ساحر حقائقِ حیات کی تلخیوں کی طرف دوبارہ متوجہ ہو، تو صرف تلخیوں کا ترجمان نہ ہو، بلکہ اسے ان تلخیوں میں شیرینی کی ہلکی سی دھاری کا بھی عرفان ہو، وہ شیرینی جس نے "گرانبار سلاسل" تلے دب کر ساحر کا نظریۂ جمال ہی بدل دیا تھا :-

ریگ زاروں میں بگولوں کے سوا کچھ بھی نہیں!

جس طرح پہلے عرض کیا جا چکا ہے ساحر نظم کے ہئیتی نظام میں کسی تبدیلی کا روادار معلوم نہیں ہوتا ہئیت کے بجائے وہ معنی کی طرف متوجہ رہا ہے، اس نے اظہارِ خیال کے لئے چند صورتیں معین کر لی ہیں، اور وہ ان صورتوں میں موضوع وخیال کی نئی نئی جنتیں آباد کرتا ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ اس کی شاعری میں ابہام کا شائبہ بھی نہیں، نہایت نرم ونازک اشاریت اس کے فن کی خصوصیت ہے، جو پڑھنے والے کے ذہن میں ایک ارتعاش سا پیدا کر کے معانی کی ایک بے کراں دنیا پر سے نقاب اٹھا دیتی ہے، قانون، مذہب یا سماج کا ابہام دور کرنے کے لئے وہ ابہام ہی سے کام نہیں لیتا، بلکہ نہایت صاف ستھرے انداز میں اس ابہام کی قلعی کھولتا ہے وہ قاری کو متاثر اور محظوظ کرتا ہے، دور از کار استعاروں اور اجنبی تشبیہوں سے اس کی طبیعت کو مکدر نہیں کرتا، کیونکہ تکدر شاعری کے لئے زہر ہے،

ساحر کے فن کی خصوصیات میں احساس کی شدت سب سے ممیّز اور نمایاں ہے، اور چونکہ اس کا احساس زندہ اور بیدار ہے، اس لئے اس کی انفرادیت کسی قسم کے بیرونی اثرات کی شرمندۂ احسان نہیں، اُردو کے جدید شعرا میں اس کا مرتبہ بہت بلند ہے، اگر اس کے کلام کی پختگی، زبان کی پاکیزگی اور اسلوب کی بے پناہ جاذبیت کے مقابلہ میں اس کی عمر کو دیکھا جائے، تو تعجب ہوتا ہے، لیکن شاعری سن وسال کی محتاج نہیں، ساحر کی اٹھان اس کے نہایت درخشندہ مستقبل کی غمازی کر رہی ہے، اگر وہ افراط تفریط سے بچا رہا، اور اپنے خلوص کو بے لوث اور اپنے احساس کو بے داغ رکھنے میں کامیاب ہو گیا، تو وہ بہت جلد ہندوستان کے ممتاز ترین شعراء کی صف میں شامل ہو جائے گا۔۔۔ میں اس نتیجہ پر محض اس لئے پہنچا ہوں، کہ جدید تر شعرا میں مجھے ساحر کی سی مکمل انفرادیت کہیں نظر نہیں آئی وہ انفرادیت جس نے "تاج محل" ایسی غیر فانی نظم کو

کو جنم دیا، "تاج محل" کے متعلق آج تک ہر زبان میں بے شمار مضامین نثر و نظم لکھے گئے، لیکن جس زاویہ سے ساحر نے اس مرمریں روضہ کو دیکھا، وہ اول و آخر ساحر ہی کا ہے، صرف مارکس کا ایک مخلص مقلّد ہی اس نوع کے خیالات کا اظہار کر سکتا تھا۔ ساحر کی "تاج محل" ہی میرے اس دعویٰ کے ثبوت کے لئے کافی ہے کہ معنی یا مواد یا موضوع کے مقابلہ میں ہئیت فروعی حیثیت رکھتی ہے اور اگر کہنے والے کا احساس پختہ اور تخیّل صاف ستھرا اور بلند ہے، تو معنی خود بخود اپنی پسند کی ہئیت میں جلوہ گر ہوتے رہیں گے،

میں ساحر کے فن کی خصوصیات گنوا کر اور اس کی مثالیں پیش کر کے اس تحریر کو طول نہیں دینا چاہتا، اس مجموعہ کی کوئی نظم لے لیجئے، آپ کو اس میں شدتِ احساس، تفکّر کی گہرائی، صوتی آہنگ، مشاہدے کی ہمہ گیری اور ماحول کی عکاسی کی بہت سی مثالیں مل جائیں گی، "چکلے" میں شاعر کی قوتِ مشاہدہ اپنے عروج پر ہے، لیکن اسی نظم میں آپ کو دیگر خصوصیات بھی پوری شدت سے جلوہ گر نظر آئیں گی، اس طرح "تاج محل"۔ "لمحۂ غنیمت"۔ اجنبی محافظ"۔ "شاہراہِ فردا" "شہزادے"۔ "فنکار"۔ "کبھی کبھی"۔ "فرار"۔ "کل اور آج"۔ "ہراس" اور "اسی دوراہے پر" وغیرہ تمام نظمیں شدتِ تاثر، حسنِ بیان اور رعنائی خیال کے لحاظ سے اردو شاعری میں معرکے کے فن پارے ہیں، جن کا شاعر نہ پرانے شاعروں کے روائتی لاابالیانہ پن کا شکار ہے، اور نہ نئے شاعروں کے جنونِ جدت پسندی کا، وہ ایک واضح اور معین پیغام کا حامل ہے، ایک ایسا پیغام جس میں کسی قسم کے تکلف اور تزئین کی ضرورت نہیں ؎

دیکھو دور افق کی ضو سے جھانک رہا ہے سرخ سویرا!

لاہور
۱۹۴۵ء

احمد ندیم قاسمی

ابھی نہ چھیڑ محبت کے گیت اے مطرب
ابھی حیات کا ماحول خوشگوار نہیں

دیباچہ

(طبع سوم)

تلخیاں کا تیسرا ایڈیشن آج سے چھ ماہ قبل اشاعت کے لئے دیا گیا تھا، لیکن انہی دنوں پنجاب میں فرقہ وارانہ فساد شروع ہو گئے، اور نہ صرف اس مجموعے کی اشاعت نامعلوم مدت کے لئے التوا کا شکار ہو گئی، بلکہ وہ تمام قدریں خطرے میں پڑ گئیں، جن سے ادب، آرٹ اور تہذیب کے سرچشمے پھوٹتے ہیں، آج بھی جبکہ اس مجموعے کی اشاعت کا سوال دوبارہ زیرِ غور لایا گیا ہے، حالات —— ادب اور ادیب دونوں کے لئے مخدوش ہیں۔ اگر یہ مجموعہ آپ تک پہنچ سکا تو مجھے دلی مسرت ہوگی، اسلئے نہیں کہ یہ مجموعہ میری نظموں کا مجموعہ ہے، بلکہ اس لئے کہ اب یہ کتاب، یا کوئی دوسری کتاب آپ تک اسی وقت پہنچ سکے گی، جب ترقی اور انقلاب کی طاقتیں، رجعت اور فرقہ پرستی کی قوتوں پر کم از کم اس حد تک قابو پا لیں گی، کہ موجودہ کشت و خون

کا ہنگامہ رُک جائے۔ اور تہذیبی زندگی کو از سرِ نو ترتیب دینے کے امکانات فراہم ہوسکیں۔

نظموں کی ترتیب کم و بیش وہی ہے، جو دوسرے ایڈیشن میں تھی، البتہ آخر میں آٹھ دس نئی نظمیں بڑھا دی گئی ہیں، جن میں سے ایک نظم 'مفاہمت' ہے، جو میں نے بمبئی میں جشنِ آزادی کے موقع پر لکھی تھی، میرا نقطۂ نظر یہ ہے، کہ ماؤنٹ بیٹن پلان سے ہمیں نہ مکمل آزادی ملتی ہے، اور نہ ہندو مسلم مسئلے کا کوئی موزوں حل دریافت ہوتا ہے، یہ ایک طبقاتی مفاہمت ہے، جو بڑھتی ہوئی عوامی تحریکات کے خلاف برطانوی سامراج اور دیسی سرمایہ داروں کے درمیان طے پائی ہے، آخری بند میں ان خطرات کی طرف اشارہ ہے، جو پندرہ اگست کی دستوری تبدیلیوں کی تہ میں پوشیدہ تھے، اور جن سے ہمارا ملک بری طرح دوچار ہے، یہ الگ بات ہے کہ عوام کی بڑھتی ہوئی طاقت سے بوکھلائی ہوئی سرمایہ دار قیادت ان خطرات کو بروقت نہیں دیکھ سکی۔ مجموعے کی آخری نظم 'آج' ہے، اسے میں نے ۱۱ ستمبر کو دہلی میں لکھا تھا۔ اس روز دہلی میں وحشت اور بربریت کی وہی داستان دہرائی جا رہی تھی، جس نے پورے پنجاب کی سماجی اور تہذیبی زندگی کو تاراج کر ڈالا ہے، جس وقت میں نے اس نظم کو نشر کیا، میرا تخاطب پاکستان اور ہندوستان دونوں مملکتوں کے عوام سے تھا، یہ نظم میرے پورے مجموعے سے زیادہ اہم ہے، کیونکہ آج کے حالات میں اگر مجھ سے نثر میں بھی کچھ کہنے کے لئے کہا جائے، تو شاید میں اس کے علاوہ اور کچھ نہ کہہ سکوں،

آخر میں مجھے اپنی نظموں کی فنی حیثیت کے بارے میں کچھ کہنا ہے، اور وہ یہ کہ جہاں تک میری عام نظموں کا تعلق ہے، ادبی نقادوں نے ان کے بارے میں اچھی رائے دی ہے، لیکن میری کچھ نظمیں ایسی بھی ہیں، جن کے متعلق بعض ادبی حلقوں کا خیال ہے، کہ وہ ضرورت

سے زیادہ سپاٹ ہیں، یہاں میرا مقصد اس اعتراض کی صداقت سے منکر ہونا نہیں، شعر کے بارے میں اپنا نظریہ بیان کرنا ہے، میں شعر کے فنی لوازم اور جمالیاتی پہلو کا قائل اور مداح ہوں، اور میں نے اپنی عام نظموں میں (جن کا مخاطب سماج کا متوسط طبقہ ہے) اس چیز کا خیال بھی رکھا ہے، لیکن میں صرف متوسط طبقے کے لئے ہی نہیں لکھتا، عام مزدوروں اور کسانوں کے لئے بھی لکھتا ہوں، اگرچہ اس مجموعے میں ایسی نظموں کی تعداد نسبتاً بہت کم ہے، سماج کے اس طبقے کو حکمراں جماعتوں نے علم، آرٹ اور ادب کے سرچشموں سے بہت دور کر رکھا ہے اس طبقے تک پہنچنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنی بات سادہ زبان میں کہیں، اور اس کے لئے براہِ راست لب و لہجہ اختیار کریں۔ مجھے معلوم ہے کہ ایسا کرنے وقت فن کار کو اپنے فن کی روایاتی بلندی سے نیچے اتر کر ایک نیا معیار قائم کرنا پڑے گا، لیکن موجودہ سماجی حالت میں یہ ضروری بھی ہے، اور ناگزیر بھی، ورنہ ہمیں اپنے فن کا دائرہ انہی لوگوں تک محدود کر لینا پڑے گا، جو سماج میں حقوق یافتہ طبقے کی حیثیت رکھتے ہیں، اور علم و فن کے ذخیروں سے لطف اندوز ہونے کے سماجی وسائل پر قابض ہیں۔ یہ چیز جہاں فن کو انسانیت کا ترجمان بنانے کی بجائے لوگوں کے مختصر سے گروہ کے لئے مخصوص کر دے گی، وہاں یہ خطرہ بھی پیدا ہو گا، کہ فن کار نادانستہ طور پر ترقی اور انقلاب کی قوتوں کا ساتھ چھوڑ کر اپنے فن کی کلیاں ان قوتوں کے دامنِ نشاط میں ڈال دے۔ جو تاریخی اعتبار سے انحطاط پذیر ہیں، —— بہر حال اگر میرے نقاد میری ان نظموں کو فن کا مرتبہ دینے کے لئے تیار نہ ہوں، تو میں مصر نہیں ہوں گا۔

مجموعے کا سرورق محترمہ —— مس رضیہ فیروز الدین کی عنایت ہے، جس کے لئے میں ان کا شکر گزار ہوں۔

ساحر لدھیانوی

لاہور۔ نومبر ۱۹۴۴ء

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

ردِّ عمل

چند کلیاں نشاط کی چُن کر
مدتوں محوِ یاس رہتا ہوں
تیرا ملنا خوشی کی بات سہی
تجھ سے مل کر اداس رہتا ہوں

ایک منظر

افق کے دریچے سے کرنوں نے جھانکا — فضا تن گئی راستے مسکرائے
سمٹنے لگی نرم کہرے کی چادر — جواں شاخساروں نے گھونگھٹ اٹھائے
پرندوں کی آواز سے کھیت چونکے — پُراسرار لَے میں رہٹ گنگنائے
حسیں شبنم آلود پگڈنڈیوں سے — لپٹنے لگے سبز پیڑوں کے سائے

وہ دور ایک ٹیلے پہ آنچل سا جھلکا
تصوّر میں لاکھوں دیے جھلملائے

ایک واقعہ

اندھیاری رات کے آنگن میں یہ صبح کے قدموں کی آہٹ
یہ بھیگی بھیگی سرد ہوا یہ ہلکی ہلکی دھندلاہٹ
گاڑی میں ہوں تنہا محوِ سفر اور نیند نہیں ہے آنکھوں میں
بھولے بسرے رومانوں کے خوابوں کی زمیں ہے آنکھوں میں
اگلے دن ہاتھ ہلاتے ہیں، پچھلی پیتیں یاد آتی ہیں
گم گشتہ خوشیاں آنکھوں میں آنسو بن کر لہراتی ہیں

سینے کے ویراں گوشوں میں اک ٹیس سی کروٹ لیتی ہے

ناکام امنگیں روتی ہیں امید سہارے دیتی ہے

وہ راہیں ذہن میں گھومتی ہیں جن راہوں سے آج آیا ہوں

کتنی امید سے پہنچا تھا کتنی مایوسی لایا ہوں

•

• زندگی کو بے نیازِ آرزو کرنا پڑا

آہ کن آنکھوں سے انجامِ تمنا دیکھتے

•

یکسوئی

عہدِ گم گشتہ کی تصویر دکھاتی کیوں ہو؟
ایک آوارۂ منزل کو ستاتی کیوں ہو؟

وہ حسیں عہد جو شرمندۂ ایفا نہ ہؤا
اس حسیں عہد کا مفہوم جتاتی کیوں ہو؟

زندگی شعلۂ بے باک بنا لو اپنی
خود کو خاکسترِ خاموش بناتی کیوں ہو؟

میں تصوف کے مراحل کا نہیں ہوں قائل
میری تصویر پہ تم پھول چڑھاتی کیوں ہو؟

کون کہتا ہے کہ آہیں ہیں مصائب کا علاج
جان کو اپنی عبث روگ لگاتی کیوں ہو؟
ایک سرکش سے محبت کی تمنا رکھ کر
خود کو آئین کے پھندوں میں پھنساتی کیوں ہو؟
میں سمجھتا ہوں تقدس کو تمدن کا فریب
تم رسومات کو ایمان بناتی کیوں ہو؟
جب تمہیں مجھ سے زیادہ ہے زمانے کا خیال
پھر مری یاد میں یوں اشک بہاتی کیوں ہو؟
تم میں ہمت ہے تو دنیا سے بغاوت کر دو
ورنہ ماں باپ جہاں کہتے ہیں شادی کر لو

شہکار

مصوّر! میں ترا شہکار واپس کرنے آیا ہوں

اب ان رنگین رخساروں میں تھوڑی زردیاں بھر دے

حجاب آلود نظروں میں ذرا بے باکیاں بھر دے

لبوں کی بھیگی بھیگی سلوٹوں کو مضمحل کر دے

نمایاں رنگِ پیشانی پہ عکسِ سوزِ دل کر دے

تبسّم آفریں چہرے میں کچھ سنجیدہ پن بھر دے
جواں سینے کی مخروطی اٹھانیں سرنگوں کر دے
گھنے بالوں کو کم کر دے مگر رخشندگی دیدے
نظر سے تمکنت لے کر مذاقِ عاجزی دیدے
مگر ہاں بینچ کے بدلے اسے صوفے پہ بٹھلا دے
یہاں سے میری بجائے اک چمکتی کار دکھلا دے

غزل

محبت ترک کی میں نے، گریباں سی لیا میں نے
زمانے اب تو خوش ہو، زہر یہ بھی پی لیا میں نے

ابھی زندہ ہوں لیکن سوچتا رہتا ہوں خلوت میں
کہ اب تک کس تمنا کے سہارے جی لیا میں نے

انہیں اپنا نہیں سکتا مگر اتنا بھی کیا کم ہے
کہ کچھ مدت حسیں خوابوں میں کھو کر جی لیا میں نے

بس اب تو دامنِ دل چھوڑ دو بے کار امیدو
بہت دکھ سہہ لئے میں نے بہت دن جی لیا میں نے

نذرِ کالج

اے سرزمینِ پاک کے یارانِ نیک نام
باصد خلوص شاعرِ آوارہ کا سلام
اے وادیٔ جمیل مرے دل کی دھڑکنیں
آداب کہہ رہی ہیں تری بارگاہ میں
تو آج بھی ہے میرے لئے جنّتِ خیال
ہیں تجھ میں دفن میری جوانی کے چار سال
کمھلائے ہیں یہاں پہ مری زندگی کے پھول
ان راستوں میں دفن ہیں میری خوشی کے پھول

(لدھیانہ گورنمنٹ کالج)

تیری نوازشوں کو بھلایا نہ جائے گا
ماضی کا نقش دل سے مٹایا نہ جائے گا

تیری نشاط خیز فضائے جواں کی خیر
گلہائے رنگ و بو کے حسین کارواں کی خیر

دورِ خزاں میں بھی تری کلیاں کھلی رہیں
تا حشر یہ حسین فضائیں بسی رہیں

ہم ایک خار تھے جو چمن سے نکل گئے
ننگِ وطن تھے حدِّ وطن سے نکل گئے

گائے ہیں اس فضا میں وفاؤں کے راگ بھی
نغماتِ آتشیں سے بکھیری ہے آگ بھی

سرکش بنے ہیں گیت بغاوت کے گائے ہیں
برسوں نئے نظام کے نقشے بنائے ہیں

نغمہ نشاطِ روح کا گایا ہے بارہا
گیتوں میں آنسوؤں کو چھپایا ہے بارہا
معصومیوں کے جرم میں بدنام بھی ہوئے
تیرے طفیل موردِ الزام بھی ہوئے
اس سرزمیں پہ آج ہم اک بار ہی سہی
دنیا ہمارے نام سے بیزار ہی سہی
لیکن ہم ان فضاؤں کے پالے ہوئے تو ہیں
گر یاں نہیں تو یاں سے نکالے ہوئے تو ہیں

۱۹۴۳ء

غزل

دیکھا تو تھا یوں ہی کسی غفلت شعار نے
دیوانہ کر دیا دلِ بے اختیار نے

اے آرزو کے دھندلے خرابو جواب دو
پھر کس کی یاد آئی تھی مجھ کو پکارنے

تجھ کو خبر نہیں مگر اک سادہ لوح کو
برباد کر دیا ترے دو دن کے پیار نے

میں اور تم سے ترکِ محبت کی آرزو
دیوانہ کر دیا ہے غمِ روزگار نے

اب اے دلِ تباہ ترا کیا خیال ہے؟
ہم تو چلے تھے کاکلِ گیتی سنوارنے

معذوری

خلوت و جلوت میں تم مجھ سے ملی ہو بارہا
تم نے کیا دیکھا نہیں، میں مسکرا سکتا نہیں
میں کہ مایوسی مری فطرت میں داخل ہو چکی
جبر بھی خود پر کروں تو گنگنا سکتا نہیں
مجھ میں کیا دیکھا کہ تم الفت کا دم بھرنے لگیں
میں تو خود اپنے بھی کوئی کام آ سکتا نہیں

روحِ افزا ہیں جنونِ عشق کے نغمے مگر
اب میں ان گائے ہوئے گیتوں کو گا سکتا نہیں

میں نے دیکھا ہے شکستِ سازِ الفت کا سماں
اب کسی تحریک پر بربط اٹھا سکتا نہیں

دل تمہاری شدتِ احساس سے واقف تو ہے
اپنے احساسات سے دامن چھڑا سکتا نہیں

تم مری ہو کر بھی بیگانہ ہی پاؤ گی مجھے
میں تمہارا ہو کے بھی تم میں سما سکتا نہیں

گائے ہیں میں نے خلوصِ دل سے بھی الفت کے گیت
اب ریاکاری سے بھی چاہوں تو گا سکتا نہیں

کس طرح تم کو بنا لوں میں شریکِ زندگی
میں تو اپنی زندگی کا بار اٹھا سکتا نہیں

یاس کی تاریکیوں میں ڈوب جانے دو مجھے
اب میں شمعِ آرزو کی لَو بڑھا سکتا نہیں

•

پھر نہ کیجئے مری گستاخ نگاہی کا گِلہ
دیکھئے آپ نے پھر پیار سے دیکھا مجھ کو

•

خانہ آبادی

(ایک دوست کی شادی پر)

ترانے گونج اٹھے ہیں فضا میں شادیانوں کے
ہوا ہے عطر آگیں، ذرہ ذرہ مسکراتا ہے

مگر دور — ایک افسردہ مکاں میں سرد بستر پر
کوئی دل ہے کہ ہر آہٹ پہ یونہی چونک جاتا ہے

میری آنکھوں میں آنسو آگئے "نادیدہ آنکھوں" کے
میرے دل میں کوئی غمگین نغمہ سرسراتا ہے

یہ رسمِ انقطاعِ عہدِ الفت، یہ حیاتِ نو
محبت رو رہی ہے اور تمدن مسکراتا ہے

یہ شادی خانہ آبادی ہو، میرے محترم بھائی!
"مبارک" کہہ نہیں سکتا، مرا دل کانپ جاتا ہے

سرزمینِ یاس

جینے سے دل بیزار ہے
ہر سانس اک آزار ہے

کتنی حزیں ہے زندگی
اندوہ گیں ہے زندگی

وہ بزمِ احبابِ وطن
وہ ہم نوایانِ سخن

آتے ہیں جس دم یاد اب
کرتے ہیں دل ناشاد اب

گذری ہوئی رنگینیاں
کھوئی ہوئی دلچسپیاں

پہروں رلاتی ہیں مجھے اکثر ستاتی ہیں مجھے
وہ زمزمے وہ چہچہے وہ روح افزا قہقہے
جب دل کو موت آئی نہ تھی یوں بے حسی چھائی نہ تھی
کالج کی رنگیں وادیاں وہ دل نشیں آبادیاں
وہ نازنینانِ وطن زہرہ جبینانِ وطن
جن میں سے اک رنگیں قبا آتش نفس آتش نوا
کر کے محبت آشنا رنگِ عقیدت آشنا
میرے دلِ ناکام کو خوں گشتۂ آلام کو
داغِ جدائی دے گئی ساری خدائی لے گئی
ان ساعتوں کی یاد میں ان راحتوں کی یاد میں
مغموم سا رہتا ہوں میں غم کی کسک سہتا ہوں میں
سنتا ہوں جب احباب سے قصّے غمِ ایام کے

بیتاب ہو جاتا ہوں میں
آہوں میں کھو جاتا ہوں میں

پھر وہ عزیز و اقربا
جو توڑ کر عہدِ وفا

احباب سے منہ موڑ کر
دنیا سے رشتہ توڑ کر

حدِّ افق کے اس طرف
رنگِ شفق کے اس طرف

اک وادیٔ خاموش کی
اک عالمِ بیہوش کی

گہرائیوں میں سو گئے
تاریکیوں میں کھو گئے

ان کا تصور ناگہاں
لیتا ہے دل میں چٹکیاں

اور خوں رلاتا ہے مجھے
بے کل بناتا ہے مجھے

وہ گاؤں کی ہمجولیاں
مفلوک دہقاں زادیاں

جو دستِ فرطِ یاس سے
اور یورشِ افلاس سے

عصمت لٹا کر رہ گئیں
خود کو گنوا کر رہ گئیں

غمگیں جوانی بن گئیں
رسوا کہانی بن گئیں

ان سے کبھی گلیوں میں اب ہوتا ہوں میں دوچار جب
نظریں جھکا لیتا ہوں میں خود کو چھپا لیتا ہوں میں
کتنی حزیں ہے زندگی
اندوہ گیں ہے زندگی

غزل

خود داریوں کے خون کو ارزاں نہ کر سکے
ہم اپنے جوہروں کو نمایاں نہ کر سکے

ہو کر خرابِ مے ترے غم تو بھلا دیئے
لیکن غمِ حیات کا درماں نہ کر سکے

ٹوٹا طلسمِ عہدِ محبت کچھ اس طرح
پھر آرزو کی شمع فروزاں نہ کر سکے

ہر شے قریب آ کے کشش اپنی کھو گئی
وہ بھی علاجِ شوقِ گریزاں نہ کر سکے

کس درجہ دل شکن تھے محبت کے حادثے
ہم زندگی میں پھر کوئی ارماں نہ کر سکے

مایوسیوں نے چھین لئے دل کے ولولے
وہ بھی نشاطِ روح کا ساماں نہ کر سکے

شکست

اپنے سینے سے لگائے ہوئے امید کی لاش

مدتوں زیست کو ناشاد کیا ہے میں نے

تو نے تو ایک ہی صدمے سے کیا تھا دو چار

دل کو ہر طرح سے برباد کیا ہے میں نے

جب بھی راہوں میں نظر آئے حریری ملبوس

سرد آہوں میں تجھے یاد کیا ہے میں نے

اور اب جب کہ مری روح کی پہنائی میں
ایک سنسان سی مغموم گھٹا چھائی ہے
تو دمکتے ہوئے عارض کی شعاعیں لیکر
گل شدہ شمعیں جلانے کو چلی آئی ہے

میری محبوب، یہ ہنگامۂ تجدیدِ وفا
میری افسردہ جوانی کے لئے راس نہیں
میں نے جو پھول چنے تھے ترے قدموں کے لئے
ان کا دھندلا سا تصور بھی مرے پاس نہیں

ایک یخ بستہ اداسی ہے دل و جاں پہ محیط
اب مری روح میں باقی ہے نہ امید نہ جوش
رہ گیا دب کے گراں بار سلاسل کے تلے
میری درماندہ جوانی کی امنگوں کا خروش

ریگ زاروں میں بگولوں کے سوا کچھ بھی نہیں
سایۂ ابرِ گریزاں سے مجھے کیا لینا!
بجھ چکے ہیں مرے سینے میں محبت کے کنول
اب ترے حسنِ پشیماں سے مجھے کیا لینا؟

تیرے عارض پہ یہ ڈھلکے ہوئے سیمیں آنسو،
میری افسردگیٔ غم کا مداوا تو نہیں
تیری محجوب نگاہوں کا پیامِ تجدید
اک تلافی ہی سہی — میری تمنا تو نہیں

غزل

تنگ آچکے ہیں کشمکشِ زندگی سے ہم
ٹھکرا نہ دیں جہاں کو کہیں بے دلی سے ہم

مایوسیٔ مآلِ محبت نہ پوچھیے
اپنوں سے پیش آتے ہیں بیگانگی سے ہم

لو آج ہم نے توڑ دیا رشتۂ امید
لو اب کبھی گلہ نہ کریں گے کسی سے ہم

ابھریں گے ایک بار ابھی دل کے ولولے

گو دب گئے ہیں بارِ غمِ زندگی سے ہم

گر زندگی میں مل گئے پھر اتفاق سے

پوچھیں گے اپنا حال تری بے بسی سے ہم

اللہ رے فریبِ مشیت کہ آج تک

دنیا کے ظلم سہتے رہے خامشی سے ہم

کسی کو اُداس دیکھ کر!

تمہیں اداس سی پاتا ہوں میں کئی دن سے
نہ جانے کون سے صدمے اٹھا رہی ہو تم
وہ شوخیاں وہ تبسّم وہ قہقہے نہ رہے
ہر ایک چیز کو حسرت سے دیکھتی ہو تم
چھپا چھپا کے خموشی میں اپنی بے چینی
خود اپنے راز کی تشہیر بن گئی ہو تم

مری امید اگر مٹ گئی تو مٹنے دو
امید کیا ہے بس اک پیش و پس ہے کچھ بھی نہیں
مری حیات کی غمگینیوں کا غم نہ کرو
غمِ حیات غمِ یک نفس ہے کچھ بھی نہیں
تم اپنے حسن کی رعنائیوں پہ رحم کرو
وفا فریب ہے، طولِ ہوس ہے کچھ بھی نہیں

مجھے تمہارے تغافل سے کیوں شکایت ہو؟
مری فنا مرے احساس کا تقاضا ہے
میں جانتا ہوں کہ دنیا کا خوف ہے تم کو
مجھے خبر ہے یہ دنیا عجیب دنیا ہے
یہاں حیات کے پردے میں موت پلتی ہے

شکستِ ساز کی آواز روحِ نغمہ ہے

مجھے تمہاری جدائی کا کوئی رنج نہیں
مرے خیال کی دنیا میں میرے پاس ہو تم
یہ تم نے ٹھیک کہا ہے تمہیں ملا نہ کروں
مگر مجھے یہ بتا دو کہ کیوں اداس ہو تم
خفا نہ ہونا مری جرأتِ تخاطب پر
تمہیں خبر ہے مری زندگی کی آس ہو تم

مرا تو کچھ بھی نہیں ہے میں رو کے جی لوں گا
مگر خدا کے لئے تم اسیرِ غم نہ رہو
ہوا ہی کیا جو زمانے نے تم کو چھین لیا

یہاں پہ کون ہوا ہے کسی کا ، سوچ تو
مجھے قسم ہے مری دکھ بھری جوانی کی
میں خوش ہوں مری محبت کے پھول ٹھکرا دو

میں اپنی روح کی ہر اک خوشی مٹا لوں گا
مگر تمہاری مسرت مٹا نہیں سکتا
میں خود کو موت کے ہاتھوں میں سونپ سکتا ہوں
مگر یہ بارِ مصائب اٹھا نہیں سکتا
تمہارے غم کے سوا اور بھی تو غم ہیں مجھے
نجات جن سے میں اک لحظہ پا نہیں سکتا

یہ اُونچے اونچے مکانوں کی ڈیوڑھیوں کے تلے

ہر ایک گام پہ بھوکے بھکاریوں کی صدا
ہر ایک گھر میں یہ افلاس اور بھوک کا شور
ہر ایک سمت یہ انسانیت کی آہ و بکا
یہ کارخانوں میں لوہے کا شور و غل جس میں
ہے دفن لاکھوں غریبوں کی روح کا نغمہ

یہ شاہراہوں پہ رنگین ساریوں کی جھلک
یہ جھونپڑوں میں غریبوں کے بے کفن لاشے
یہ مال روڈ پہ کاروں کی ریل پیل کا شور
یہ پٹڑیوں پہ غریبوں کے زرد رُو بچے

گلی گلی میں یہ بکتے ہوئے جواں چہرے

حسین آنکھوں میں افسردگی سی چھائی ہوئی
یہ جنگ اور یہ میرے وطن کے شوخ جواں
خریدی جاتی ہیں اُٹھتی جوانیاں جن کی
یہ بات بات پہ قانون و ضابطے کی گرفت
یہ ذلتیں، یہ غلامی، یہ دورِ مجبوری
یہ غم بہت ہیں مری زندگی مٹانے کو
اُداس رہ کے مرے دل کو اور رنج نہ دو

غزل

ہوس نصیب نظر کو کہیں قرار نہیں
میں منتظر ہوں مگر تیرا انتظار نہیں
ہمیں سے رنگِ گلستاں ہمیں سے رنگ بہار
ہمیں کو نظمِ گلستاں پہ اختیار نہیں
ابھی نہ چھیڑ محبت کے گیت اے مطرب
ابھی حیات کا ماحول خوشگوار نہیں

تمہارے عہدِ وفا کو میں عہد کیا سمجھوں
مجھے خود اپنی محبّت کا اعتبار نہیں

نہ جانے کتنے گِلے اس میں مضطرب ہیں ندیم
وہ ایک دل جو کسی کا گِلہ گزار نہیں

گریز کا نہیں قائل حیات سے۔ لیکن
جو سچ کہوں تو مجھے موت ناگوار نہیں

یہ کس مقام پہ پہنچا دیا زمانے نے
کہ اب حیات پہ تیرا بھی اختیار نہیں

میرے گیت

مرے سرکش ترانے سُن کے دنیا یہ سمجھتی ہے
کہ شاید میرے دل کو عشق کے نغموں سے نفرت ہے
مجھے ہنگامۂ جنگ و جدل میں کیف ملتا ہے
مری فطرت کو خونریزی کے افسانوں سے رغبت ہے
مری دنیا میں کچھ وقعت نہیں ہے رقص و نغمہ کی
مرا محبوب نغمہ شورِ آہنگِ بغاوت ہے

مگر اے کاش دیکھیں وہ مری پُر سوز راتوں کو
میں جب تاروں پہ نظریں گاڑ کر آنسو بہاتا ہوں
تصوّر بن کے بھُولی وارداتیں یاد آتی ہیں
تو سوز و درد کی شدّت سے پہروں تلملاتا ہوں
کوئی خوابوں میں خوابیدہ امنگوں کو جگاتی ہے
تو اپنی زندگی کو موت کے پہلو میں پاتا ہوں

میں شاعر ہوں، مجھے فطرت کے نظّاروں سے اُلفت ہے
مرا دل دشمنِ نغمہ سرائی ہو نہیں سکتا
مجھے انسانیت کا درد بھی بخشا ہے قدرت نے
مرا مقصد فقط شعلہ نوائی ہو نہیں سکتا
جواں ہوں میں، جوانی لغزشوں کا ایک طوفاں ہے
مری باتوں میں رنگِ پارسائی ہو نہیں سکتا

مرے سرکش ترانوں کی حقیقت ہے، تو اتنی ہے
کہ جب میں دیکھتا ہوں بھوک کے مارے کسانوں کو
غریبوں، مفلسوں کو، بیکسوں کو، بے سہاروں کو
سسکتی نازنینوں کو، تڑپتے نوجوانوں کو
حکومت کے تشدّد کو، امارت کے تکبّر کو
کسی کے چیتھڑوں کو اور شہنشاہی خزانوں کو
تو دل تابِ نشاطِ بزمِ عشرت لا نہیں سکتا
میں چاہوں بھی تو خواب آور ترانے گا نہیں سکتا

اشعار

ہر چند مری قوّتِ گفتار ہے محبوس
خاموش مگر طبعِ خود آرا نہیں ہوتی

معمورۂ احساس میں ہے حشر سا برپا
انسان کی تذلیل گوارا نہیں ہوتی

نالاں ہوں میں بیداریٔ احساس کے ہاتھوں
دنیا مرے افکار کی دنیا نہیں ہوتی

بیگانہ صفت جادۂ منزل سے گزر جا

ہر چیز سزاوارِ نظارا نہیں ہوتی

فطرت کی مشیّت بھی بڑی چیز ہے لیکن

فطرت کبھی بے بس کا سہارا نہیں ہوتی

سوچتا ہوں

سوچتا ہوں کہ محبت سے کنارا کر لوں
دل کو بیگانۂ ترغیب و تمنا کر لوں

سوچتا ہوں کہ محبت ہے جنونِ رسوا
چند بے کار سے بیہودہ خیالوں کا ہجوم
ایک آزاد کو پابند بنانے کی ہوس
ایک بیگانے کو اپنانے کی سعیٔ موہوم

سوچتا ہوں کہ محبت ہے سرور و مستی
اس کی تنویر سے روشن ہے فضائے ہستی

سوچتا ہوں کہ محبت ہے بشر کی فطرت
اس کا مٹ جانا مٹا دینا بہت مشکل ہے

سوچتا ہوں کہ محبت سے ہے تابندہ حیات
آپ یہ شمع بجھا دینا بہت مشکل ہے

سوچتا ہوں کہ محبت پہ کڑی شرطیں ہیں
اس تمدن میں مسرت پہ بڑی شرطیں ہیں

سوچتا ہوں کہ محبت ہے، اک افسردہ سی لاش
چادرِ عزت و ناموس میں کفنائی ہوئی
دورِ سرمایہ کی روندی ہوئی رسوا ہستی
درگہِ مذہب و اخلاق سے ٹھکرائی ہوئی

سوچتا ہوں کہ بشر اور محبت کا جنوں
ایسے بوسیدہ تمدن میں ہے اک کارِ زبوں

سوچتا ہوں کہ محبت نہ بچے گی زندہ
پیش ازاں وقت کہ سڑ جائے یہ گلتی ہوئی لاش
یہی بہتر ہے کہ بیگانۂ الفت ہو کر
اپنے سینے میں کروں جذبۂ نفرت کی تلاش

اور سودائے محبت سے کنارا کر لوں
دل کو بیگانۂ ترغیب و تمنا کر لوں

ناکامی

میں نے ہر چند غمِ عشق کو کھونا چاہا
غمِ الفت غمِ دنیا میں سمونا چاہا

وہی افسانے مری سمت رواں ہیں ابتک
وہی شعلے مرے سینے میں نہاں ہیں ابتک
وہی بے سود خلش ہے مرے سینے میں ہنوز
وہی بے کار تمنائیں جواں ہیں اب تک
وہی گیسو مری راتوں پہ ہیں بکھرے بکھرے
وہی آنکھیں مری جانب نگراں ہیں ابتک

کثرتِ غم بھی مرے غم کا مداوا نہ ہوئی
میرے بے چین خیالوں کو سکوں مل نہ سکا
دل نے دنیا کے ہر اک درد کو اپنا تو لیا
مضمحل روح کو اندازِ جنوں مل نہ سکا

میری تخئیل کا شیرازۂ برہم ہے وہی
میرے بجھتے ہوئے احساس کا عالم ہے وہی
وہی بیجان ارادے وہی بے رنگ سوال
وہی بے روح کشاکش وہی بے چین خیال
آہ اس کشمکشِ صبح و مسا کا انجام
میں بھی ناکام، مری سعئ عمل بھی ناکام

مجھے سوچنے دے

میری ناکام محبّت کی کہانی مت چھیڑ
اپنی مایوس امنگوں کا فسانہ نہ سنا
زندگی تلخ سہی، زہر سہی، سم ہی سہی
درد و آزار سہی، جبر سہی، غم ہی سہی
لیکن اس درد و غم و جبر کی وسعت کو تو دیکھ
ظلم کی چھاؤں میں دم توڑتی خلقت کو تو دیکھ
اپنی مایوس امنگوں کا فسانہ نہ سنا
میری ناکام محبّت کی کہانی مت چھیڑ

جلسہ گاہوں میں یہ دہشت زدہ سہمے انبوہ
رہگذاروں پہ فلاکت زدہ لوگوں کے گروہ
بھوک اور پیاس سے پژمردہ سیہ فام زمیں
تیرہ و تار مکاں مفلس و بیمار مکیں
نوعِ انساں میں یہ سرمایہ و محنت کا تضاد
امن و تہذیب کے پرچم تلے قوموں کا فساد
ہر طرف آتش و آہن کا یہ سیلابِ عظیم
نت نئے طرز پہ ہوتی ہوئی دنیا تقسیم
لہلہاتے ہوئے کھیتوں پہ جوانی کا سماں
اور دہقان کے چھپّر میں نہ بتّی نہ دھواں
یہ فلک بوس ملیں، دلکش و سیمیں بازار
یہ غلاظت پہ جھپٹتے ہوئے بھوکے نادار

دور ساحل پہ وہ شفّاف مکانوں کی قطار
سرسراتے ہوئے پردوں میں سمٹتے گلزار
در و دیوار پہ انوار کا سیلابِ رواں
جیسے اک شاعرِ مدہوش کے خوابوں کا جہاں
یہ سبھی کیوں ہے؟ یہ کیا ہے؟ مجھے کچھ سوچنے دے
کون انساں کا خدا ہے، مجھے کچھ سوچنے دے
اپنی مایوس امنگوں کا فسانہ نہ سنا
میری ناکام محبّت کی کہانی مت چھیڑ

اشعار

عقائد وہم ہیں، مذہب خیالِ خام ہے ساقی
ازل سے ذہنِ انساں بستۂ اوہام ہے ساقی

"حقیقت آشنائی" اصل میں گم کردہ راہی ہے
عروسِ آگہی پروردۂ ابہام ہے ساقی

مبارک ہو ضعیفی کو خرد کی فلسفہ رانی
جوانی بے نیازِ عبرتِ انجام ہے ساقی

ہوس ہو گی اسیرِ حلقۂ نیک و بدِ عالم
محبت ماورائے فکرِ ننگ و نام ہے ساقی

ابھی تک راستے کے پیچ و خم سے دل دھڑکتا ہے
مرا ذوقِ طلب شاید ابھی تک خام ہے ساقی

وہاں بھیجا گیا ہوں چاک کرنے پردۂ شب کو
جہاں ہر صبح کے دامن پہ عکسِ شام ہے ساقی

مرے ساغر میں مے ہے اور ترے ہاتھوں میں بربط ہے
وطن کی سرزمیں میں بھوک سے کہرام ہے ساقی

زمانہ برسرِ پیکار ہے پُر ہول شعلوں سے
ترے لب پر ابھی تک نغمۂ خیّام ہے ساقی

صبحِ نوروز

پھوٹ پڑیں مشرق سے کرنیں
حال بنا ماضی کا فسانہ گونجا مستقبل کا ترانہ
بھیجے ہیں احباب نے تحفے آٹے پڑے ہیں میز کے کونے
دلہن بنی ہوئی ہیں راہیں
جشن مناؤ سالِ نو کے

نِکلی ہے بنگلے کے در سے

اک مفلس دہقان کی بیٹی
افسردہ مرجھائی ہوئی سی

جسم کے دکھتے جوڑ دباتی
آنچل سے سینے کو چھپاتی

مُٹھی میں اک نوٹ دبائے

جشن مناؤ سالِ نو کے

بھوکے، زرد، گداگر بچے

کار کے پیچھے بھاگ رہے ہیں
وقت سے پہلے جاگ اٹھے ہیں

پیپ بھری آنکھیں سہلاتے
سر کے پھوڑوں کو کھجلاتے

وہ دیکھو! کچھ اور بھی نکلے

جشن مناؤ سالِ نو کے

گریز

مرا جنونِ وفا ہے زوال آمادہ
شکست ہو گیا تیرا فسونِ زیبائی
ان آرزوؤں پہ چھائی ہے گردِ مایوسی
جنہوں نے تیرے تبسّم میں پرورش پائی
فریبِ شوق کے رنگیں طلسم ٹوٹ گئے
حقیقتوں نے حوادث سے پھر جِلا پائی

سکون و خواب کے پردے سرکتے جاتے ہیں
دماغ و دل میں ہے وحشت کی کارفرمائی

وہ تارے جن میں محبت کا نور تاباں تھا
وہ تارے ڈوب گئے لے کے رنگ و رعنائی

سلا گئی تھیں جنہیں تیری ملتفت نظریں
وہ درد جاگ اٹھے پھر سے لے کے انگڑائی

عجیب عالمِ افسردگی ہے رُو بہ فروغ
نہ اب نظر کو تقاضا نہ دل تمنائی

تری نظر، ترے گیسو، تری جبیں، ترے لب
مری اداس طبیعت ہے سب سے اکتائی

میں زندگی کے حقائق سے بھاگ آیا تھا
کہ مجھ کو خود میں چھپا لے تری فسوں زائی

مگر یہاں بھی تعاقب کیا حقائق نے
یہاں بھی مل نہ سکی جنتِ شکیبائی
ہر ایک ہاتھ میں لیکر ہزار آئینے
حیات، بند دریچوں سے بھی گزر آئی
مرے ہر ایک طرف ایک شور گونج اٹھا
اور اس میں ڈوب گئی عشرتوں کی شہنائی
کہاں تلک کوئی زندہ حقیقتوں سے بچے
کہاں تلک کرے چھپ چھپ کے نغمہ پیرائی
وہ دیکھ سامنے کے پرشکوہ ایواں سے
کسی کرائے کی لڑکی کی چیخ ٹکرائی
وہ پھر سماج نے دو پیار کرنے والوں کو
سزا کے طور پہ بخشی طویل تنہائی

پھر ایک تیرہ و تاریک جھونپڑی کے تلے
سسکتے بچے پہ بیوہ کی آنکھ بھر آئی
وہ پھر بکی کسی مجبور کی جواں بیٹی
وہ پھر جھکا کسی در پر غرورِ برنائی
وہ پھر کسانوں کے مجمع پہ گن مشینوں سے
حقوق یافتہ طبقے نے آگ برسائی
سکوتِ حلقۂ زنداں سے ایک گونج اٹھی
اور اس کے ساتھ مرے ساتھیوں کی یاد آئی
نہیں نہیں، مجھے یوں ملتفت نظر سے نہ دیکھ
نہیں نہیں مجھے اب تابِ نغمہ پیرائی
مرا جنونِ وفا ہے زوال آمادہ
شکست ہو گیا تیرا فسونِ زیبائی

کچھ باتیں

دیس کے ادبار کی باتیں کریں
اجنبی سرکار کی باتیں کریں
اگلی دنیا کے فسانے چھوڑ کر اس جہنم زار کی باتیں کریں
ہو چکے اوصاف پردے کے بیاں
شاہدِ بازار کی باتیں کریں ،

دہر کے حالات کی باتیں کریں — اس مسلسل رات کی باتیں کریں

من و سلویٰ کا زمانہ جا چکا — بھوک اور آفات کی باتیں کریں

آؤ پرکھیں دین کے اوہام کو

علمِ موجودات کی باتیں کریں

جابر و مجبور کی باتیں کریں — اس کہن دستور کی باتیں کریں

تاجِ شاہی کے قصیدے ہو چکے — فاقہ کش جمہور کی باتیں کریں

گرنے والے قصر کی توصیف کیا

تیشۂ مزدور کی باتیں کریں

چکلے

یہ کوچے یہ نیلام گھر دلکشی کے
یہ لٹتے ہوئے کارواں زندگی کے
کہاں ہیں؟ کہاں ہیں محافظ خودی کے
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

یہ پُرپیچ گلیاں، یہ بے خواب بازار
یہ گمنام راہی، یہ سکّوں کی جھنکار
یہ عصمت کے سودے، یہ سودوں پہ تکرار
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

تعفّن سے پُر نیم روشن یہ گلیاں
یہ مسلی ہوئی ادھ کھلی زرد کلیاں
یہ بکتی ہوئی کھوکھلی رنگ رلیاں
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

وہ اُجلے دریچوں میں پائل کی چھن چھن
تنفس کی الجھن پہ طبلے کی دھن دھن
یہ بے روح کمروں میں کھانسی کی ٹھن ٹھن
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

یہ گونجے ہوئے قہقہے راستوں پر
یہ چاروں طرف بھیڑ سی کھڑکیوں پر
یہ آوازے کھنچتے ہوئے آنچلوں پر
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

یہ پھولوں کے گجرے، یہ پیکوں کے چھینٹے
یہ بیباک نظریں، یہ گستاخ فقرے
یہ ڈھلکے بدن اور یہ مدقوق چہرے

ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

یہ بھوکی نگاہیں حسینوں کی جانب
یہ بڑھتے ہوئے ہاتھ سینوں کی جانب
لپکتے ہوئے پاؤں زینوں کی جانب

ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

یہاں پیر بھی آ چکے ہیں، جواں بھی
تنومند بیٹے بھی، اَبّا میاں بھی
یہ بیوی بھی ہے اور بہن بھی ہے ماں بھی

ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

مدد چاہتی ہے یہ حوّا کی بیٹی
یشودھا کی ہم جنس، رادھا کی بیٹی
پیمبر کی اُمت، زلیخا کی بیٹی

ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

بلاؤ خدایانِ دیں کو بلاؤ
یہ کوچے، یہ گلیاں، یہ منظر دکھاؤ
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کو لاؤ

ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

طرحِ نو

سعیِ بقائے شوکتِ اسکندری کی خیر
ماحولِ خشت بار میں شیشہ گری کی خیر

بیزار ہے کنشت و کلیسا سے اک جہاں
سوداگرانِ دین کی سوداگری کی خیر

فاقہ کشوں کے خون میں ہے جوشِ انتقام
سرمایہ کے فریبِ جہاں پروری کی خیر

طبقاتِ مبتذل میں ہے تنظیم کی نمود
شاہنشہوں کے ضابطہ خود سری کی خیر

احساس بڑھ رہا ہے حقوقِ حیات کا
پیدائشی حقوقِ ستم پروری کی خیر

ابلیس خندہ زن ہے مذاہب کی لاش پر
پیغمبرانِ دہر کی پیغمبری کی خیر

صحنِ جہاں میں رقص کناں ہیں تباہیاں
آقائے ہست و بُود کی صنعت گری کی خیر

شعلے لپک رہے ہیں جہنم کی گود سے
باغِ جناں میں جلوۂ حور و پری کی خیر

انساں الٹ رہا ہے رخِ زیست سے نقاب
مذہب کے اہتمامِ فسوں پروری کی خیر

الحاد کہہ رہا ہے مرتب جہانِ نو
دیر و حرم کے حیلۂ غارت گری کی خیر

تاج محل

تاج، تیرے لئے اک مظہرِ الفت ہی سہی
تجھ کو اس وادیٔ رنگیں سے عقیدت ہی سہی
میری محبوب! کہیں اور ملا کر مجھ سے

بزمِ شاہی میں غریبوں کا گزر کیا معنی؟
ثبت جس راہ پہ ہوں سطوتِ شاہی کے نشاں
اس پہ الفت بھری روحوں کا سفر کیا معنی؟

مری محبوب پسِ پردۂ تشہیرِ وفا
تو نے سطوت کے نشانوں کو تو دیکھا ہوتا
مردہ شاہوں کے مقابر سے بہلنے والی
اپنے تاریک مکانوں کو تو دیکھا ہوتا

ان گنت لوگوں نے دنیا میں محبت کی ہے
کون کہتا ہے کہ صادق نہ تھے جذبے ان کے
لیکن ان کے لئے تشہیر کا سامان نہیں
کیونکہ وہ لوگ بھی اپنی ہی طرح مفلس تھے

یہ عمارات و مقابر، یہ فصیلیں یہ حصار
مطلق الحکم شہنشاہوں کی عظمت کے ستوں
سینۂ دہر کے ناسور ہیں کہنہ ناسور
جذب ہے ان میں ترے اور مرے اجداد کا خوں

میری محبوب! انہیں بھی تو محبت ہو گی
جن کی صنّاعی نے بخشی ہے اسے شکلِ جمیل
ان کے پیاروں کے مقابر رہے بے نام و نمود
آج تک ان پہ جلائی نہ کسی نے قندیل

یہ چمن زار، یہ جمنا کا کنارہ یہ محل
یہ منقش در و دیوار، یہ محراب، یہ طاق
اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق
میری محبوب! کہیں اور ملا کر مجھ سے

لمحۂ غنیمت

مسکرا، اے زمینِ تیرہ و تار
سر اٹھا، اے دبی ہوئی مخلوق
دیکھ وہ مغربی افق کے قریب
آندھیاں پیچ و تاب کھانے لگیں
اور پرانے قمار خانے میں
کہنہ شاطر بہم الجھنے لگے

کوئی تیری طرف نہیں نگراں
یہ گراں بار، سرد زنجیریں
زنگ خوردہ ہیں، آہنی ہی سہی
آج موقع ہے، ٹوٹ سکتی ہیں
فرصتِ یک نفس غنیمت جان
سر اٹھا اے دبی ہوئی مخلوق!

طلوعِ اشتراکیت

جشن بپا ہے کٹیاؤں میں، اونچے ایواں کانپ رہے ہیں
مزدوروں کے بگڑے تیور دیکھ کے سلطاں کانپ رہے ہیں
جاگے ہیں افلاس کے مارے، اٹھے ہیں بے بس دکھیارے
سینوں میں طوفاں کا تلاطم، آنکھوں میں بجلی کے شرارے
چوک چوک پر گلی گلی میں سرخ پھریرے لہراتے ہیں
مظلوموں کے باغی لشکر سیل صفت امڈے آتے ہیں

شاہی درباروں کے در سے فوجی پہرے ختم ہوئے ہیں
ذاتی جاگیروں کے حق اور مہمل دعوے ختم ہوئے ہیں
شور مچا ہے بازاروں میں، ٹوٹ گئے در زندانوں کے
واپس مانگ رہی ہے دنیا غصب شدہ حق انسانوں کے
رسوا بازاری خاتونیں حقِ نسائی مانگ رہی ہیں
صدیوں کی خاموش زبانیں سحر نوائی مانگ رہی ہیں
روندی کچلی آوازوں کے شور سے دھرتی گونج اٹھی ہے
دنیا کے انیائے نگر میں حق کی پہلی گونج اٹھی ہے
جمع ہوئے ہیں چوراہوں پر آکر بھوکے اور گداگر
ایک لپکتی آندھی بن کر، ایک بھبھکتا شعلہ ہو کر
کاندھوں پر سنگین کدالیں، ہونٹوں پر بیباک ترانے
دہقانوں کے دَل نکلے ہیں اپنی بگڑی آپ بنانے

آج پرانی تدبیروں سے آگ کے شعلے تھم نہ سکیں گے
ابھرے جذبے دب نہ سکیں گے اکھڑے پرچم جم نہ سکیں گے
راج محل کے دربانوں سے یہ سرکش طوفاں نہ رکے گا
چند کرائے کے تنکوں سے سیلِ بے پایاں نہ رکے گا
کانپ رہے ہیں ظالم سلطاں ٹوٹ گئے دل جبّاروں کے
بھاگ رہے ہیں ظلِّ الٰہی، منہ اُترے ہیں غدّاروں کے
ایک نیا سورج چمکا ہے، ایک انوکھی ضوباری ہے
ختم ہوئی افراد کی شاہی اب جمہور کی سالاری ہے

اجنبی محافظ

اجنبی دیس کے مضبوط گرانڈیل جواں
اونچے ہوٹل کے درِ خاص پہ استادہ ہیں
اور نیچے میرے مجبور وطن کی گلیاں
جن میں آوارہ پھرا کرتے ہیں بھوکوں کے ہجوم
زرد چہروں پہ نقاہت کی نمود
خون میں سینکڑوں سالوں کی غلامی کا جمود

علم کے نور سے عاری — محروم
فلکِ ہند کے افسردہ نجوم
جن کی تخئیل کے پرَ
چھو نہیں سکتے ہیں اس اونچی پہاڑی کا سرا
جس پہ ہوٹل کے دریچوں میں کھڑے ہیں تن کر
اجنبی دیس کے مضبوط گرانڈیل جواں
منہ میں سگریٹ لئے ہاتھوں میں برانڈی کے گلاس
جیب میں نقرئی سکوں کی کھنک
بھوکے دہقانوں کے ہاتھوں کا عرق
رات کو جس کے عوض بکتا ہے
کسی افلاس کی ماری کا تقدس۔ یعنی
کسی دوشیزۂ مجبور کی عصمت کا غرور

محفلِ عیش کے گونجے ہوئے ایوانوں میں
اونچے ہوٹل کے شبستانوں میں
قہقہے مارتے ہنستے ہوئے استادہ ہیں
اجنبی دیس کے مضبوط گرانڈیل جواں
اسی ہوٹل کے قریب
بھوکے مجبور غلاموں کے گروہ
ٹکٹکی باندھ کے تکتے ہوئے اوپر کی طرف
منتظر بیٹھے ہیں اس ساعتِ نایاب کے جب
بوٹ کی نوک سے نیچے پھینکے
اجنبی دیس کے بے فکر جوانوں کا گروہ
کوئی سکّہ، کوئی سگرٹ، کوئی کیک
یا ڈبل روٹی کے جھوٹے ٹکڑے

چھینا جھپٹی کے مناظر کا مزہ لینے کو
پالتو کتّوں کے احساس پہ ہنس دینے کو
بھوک کے مجبور غلاموں کا گروہ
ٹکٹکی باندھ کے تکتا ہوا استادہ ہے
کاش یہ بےحِس و بےوقعت و بیدل انساں
روم کے ظلم کی زندہ تصویر
اپنا ماحول بدل دینے کے قابل ہوتے
ڈیڑھ سو سال کے پابندِ سلاسل کتّے
اپنے آقاؤں سے لے سکتے خراجِ قوت
کاش یہ اپنے لئے آپ صف آرا ہوتے
اپنی تکلیف کا خود آپ مداوا ہوتے
ان کے دل میں ابھی باقی رہتا

قومی غیرت کا وجود

ان کے سنگین و سیہ سینوں میں
گل نہ ہوتی ابھی احساس کی شمع
اور پورب سے امڈتے ہوئے خطرے کے لئے
یہ کرائے کے محافظ نہ منگانے پڑتے

بلاوا

دیکھو دور افق کی ضو سے جھانک رہا ہے سرخ سویرا
جاگو اے مزدور کسانو!
اٹھو اے مظلوم انسانو!

دھرتی کے ان داتا تم ہو جگ کے پران ودھاتا تم ہو
دھنیوں کی خوشحالی تم سے کھیتوں میں ہریالی تم سے

اونچے محل بنائے تم نے ۔۔۔ شاہی تخت سجائے تم نے
ہیرے، لعل نکالے تم نے ۔۔۔ نیزے بھالے ڈھالے تم نے
ہر بگیا کے مالی تم ہو ۔۔۔ اس سنسار کے والی تم ہو
وقت ہے دھرتی کو اپنا لو ۔۔۔ آگے بڑھو، ہتھیار سنبھالو

اٹھو اے مظلوم انسانو!
جاگو اے مزدور کسانو!

دیکھو دھرتی کانپ رہی ہے ۔۔۔ گردہ، پھریرے ڈھانپ رہی ہے
کشٹ کی جوالا پھوٹ پڑی ہے ۔۔۔ وقت ہے تھوڑا جنگ کڑی ہے
پھیل رہے ہیں کال کے گھیرے ۔۔۔ تھامو اپنے سرخ پھریرے
تم ہو جگ جنتا کے سینک ۔۔۔ پاپ کے ناشک، ستیہ کے رکھشک
بھوک کے عادی ظلم کے پالے ۔۔۔ کالی کٹیاؤں کے اجالے
کیا روکے گی تم کو شاہی ۔۔۔ تم ہو بہادر سرخ سپاہی

جاگو اے مزدور کسانو!

اٹھو اے مظلوم انسانو!

دیکھو دور افق کی ضو سے جھانک رہا ہے سرخ سویرا

شہزادے

ذہن میں عظمتِ اجداد کے قصے لے کر
اپنے تاریک گھروندوں کے خلا میں کھو جاؤ
مرمریں خوابوں کی پریوں سے لپٹ کر سو جاؤ
ابر پاروں پہ چلو، چاند ستاروں میں اڑو
یہی اجداد سے ورثہ میں ملا ہے تم کو
دور مغرب کی فضاؤں میں دہکتی ہوئی آگ
اہلِ سرمایہ کی آویزشِ باہم نہ سہی
جنگِ سرمایہ و محنت ہی سہی
دور مغرب میں ہے مشرق کی فضا میں تو نہیں

تم کو مغرب کے بکھیڑوں سے بھلا کیا لینا؟

تیرگی ختم ہوئی، سرخ شعاعیں پھیلیں
دور مغرب کی فضاؤں میں ترانے گونجے
فتح جمہور کے، انصاف کے، آزادی کے
ساحلِ شرق پہ گیسوں کا دھواں چھانے لگا
آگ برسانے لگے اجنبی توپوں کے دہن
خواب گاہوں کی چھتیں گرنے لگیں
اپنے بستر سے اٹھو!
نئے آقاؤں کی تعظیم کرو
اور ـــــ پھر اپنے گھروندوں کے خلا میں کھو جاؤ
تم بہت دیر ـــــ بہت دیر تک سوتے رہے

شعاعِ فردا

تیرہ و تار فضاؤں میں ستم خوردہ بشر
اور کچھ دیر اجالے کے لئے ترسے گا
اور کچھ دیر اُٹھے گا دلِ گیتی سے دھُواں
اور کچھ دیر فضاؤں سے لہو برسے گا

اور پھر — احمریں ہونٹوں کے تبسّم کی طرح
رات کے چاک سے پھوٹے گی شعاعوں کی لکیر

اور جمہور کے بیدار تعاون کے طفیل
ختم ہو جائے گی انساں کے لہو کی تقطیر

اور کچھ دیر بھٹک لے مرے درماندہ ندیم
اور کچھ دن ابھی زہراب کے ساغر پی لے
نور افشاں چلی آتی ہے عروسِ فردا
حال تاریک و سم افشاں سہی — لیکن جی لے

بنگال

جہانِ کہنہ کے مفلوج فلسفہ دانو!
نظامِ نو کے تقاضے سوال کرتے ہیں
یہ شاہراہیں اسی واسطے بنی تھیں کیا؟
کہ ان پہ دیس کی جنتا سسک سسک کے مرے
زمیں نے کیا اسی کارن اناج اگلا تھا
کہ نسلِ آدم و حوّا بلک بلک کے مرے

ملیں اسی لئے ریشم کے ڈھیر بنتی ہیں

کہ دخترانِ وطن تار تار کو ترسیں

چمن کو اس لئے مالی نے خوں سے سینچا تھا

کہ اس کی اپنی نگاہیں بہار کو ترسیں

زمیں کی قوتِ تخلیق کے خداوندو!

ملوں کے منتظمو! سلطنت کے فرزندو!

پچاس لاکھ فسردہ گلے سڑے ڈھانچے

نظامِ زر کے خلاف احتجاج کرتے ہیں

خموش ہونٹوں سے دم توڑتی نگاہوں سے

بشر بشر کے خلاف احتجاج کرتے ہیں

فن کار

میں نے جو گیت ترے پیار کی خاطر لکھے
آج ان گیتوں کو بازار میں لے آیا ہوں

آج دکّان پہ نیلام اٹھے گا ان کا
تو نے جن گیتوں پہ رکھی تھی محبّت کی اساس
آج چاندی کے ترازو میں تلے گی ہر چیز
میرے افکار، مری شاعری، میرا احساس

جو تری ذات سے منسوب تھے ان گیتوں کو
مفلسی جنس بنانے پر اتر آئی ہے
بھوک، تیرے رخِ رنگیں کے فسانوں کے عوض
چند اشیائے ضرورت کی تمنائی ہے

دیکھ اس عرصہ گہہِ محنت و سرمایہ میں
میرے نغمے بھی مرے پاس نہیں رہ سکتے
تیرے جلوے کسی زر دار کی میراث سہی
تیرے خاکے بھی مرے پاس نہیں رہ سکتے

آج ان گیتوں کو بازار میں لے آیا ہوں
میں نے جو گیت ترے پیار کی خاطر لکھے

کبھی کبھی

کبھی کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے
کہ زندگی تری زلفوں کی نرم چھاؤں میں
گذرنے پاتی تو شاداب ہو بھی سکتی تھی
یہ تیرگی جو مری زیست کا مقدّر ہے
تری نظر کی شعاعوں میں کھو بھی سکتی تھی

عجب نہ تھا کہ میں بیگانۂ الم رہ کر
ترے جمال کی رعنائیوں میں کھو رہتا

ترا گداز بدن، تیری نیم باز آنکھیں
انہی حسین فسانوں میں محو ہو رہتا

پکارتیں مجھے جب تلخیاں زمانے کی
ترے لبوں سے حلاوت کے گھونٹ پی لیتا

حیات چیختی پھرتی برہنہ سر اور میں
گھنیری زلفوں کے سائے میں چھپ کے جی لیتا

مگر یہ ہو نہ سکا اور اب یہ عالم ہے
کہ تو نہیں۔ ترا غم، تیری جستجو بھی نہیں
گذر رہی ہے کچھ اس طرح زندگی جیسے
اسے کسی کے سہارے کی آرزو بھی نہیں

زمانے بھر کے دکھوں کو لگا چکا ہوں گلے
گذر رہا ہوں کچھ انجانی رہگذاروں سے
مہیب سائے مری سمت بڑھتے آتے ہیں
حیات و موت کے پُرہول خارزاروں سے

نہ کوئی جادہ نہ منزل نہ روشنی کا سراغ
بھٹک رہی ہے خلاؤں میں زندگی میری
انہی خلاؤں میں رہ جاؤں گا کبھی کھو کر
میں جانتا ہوں مری ہم نفس مگر یونہی
کبھی کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے

فرار

اپنے ماضی کے تصوّر سے ہراساں ہوں میں
اپنے گزرے ہوئے ایّام سے نفرت ہے مجھے
اپنی بے کار تمنّاؤں پہ شرمندہ ہوں
اپنی بے سود امیدوں پہ ندامت ہے مجھے

میرے ماضی کو اندھیرے میں دبا رہنے دو
میرا ماضی میری ذلّت کے سوا کچھ بھی نہیں
میری امیدوں کا حاصل، میری کاوش کا صلہ
ایک بے نام اذیّت کے سوا کچھ بھی نہیں

کتنی بے کار امیدوں کا سہارا لے کر
میں نے ایوان سجائے تھے کسی کی خاطر
کتنی بے ربط تمنّاؤں کے مبہم خاکے
اپنے خوابوں میں بسائے تھے کسی کی خاطر

مجھ سے اب میری محبّت کے فسانے نہ کہو
مجھ کو کہنے دو کہ میں نے انہیں چاہا ہی نہیں

اور ـــــ وہ مست نگاہیں جو مجھے بھول گئیں
میں نے ان مست نگاہوں کو سراہا ہی نہیں

مجھ کو کہنے دو کہ میں آج بھی جی سکتا ہوں
عشق ناکام سہی، زندگی ناکام نہیں
ان کو اپنانے کی خواہش، انہیں پانے کی طلب
شوقِ بے کار سہی، سعیِ غم انجام نہیں

وہی گیسو، وہی نظریں، وہی عارض، وہی جسم
میں جو چاہوں تو مجھے اور بھی مل سکتے ہیں
وہ کنول جن کو کبھی ان کے لئے کھلنا تھا
ان کی نظروں سے بہت دور بھی کھل سکتے ہیں

کل اور آج

کل بھی بوندیں برسی تھیں

کل بھی بادل چھائے تھے

اور کوی نے سوچا تھا

بادل یہ آکاش کے سپنے ان زلفوں کے سائے ہیں

دوش ہوا پر مے خانے ہی مے خانے گھر آئے ہیں

رُت بدلے گی پھول کھلیں گے جھونکے مدھ برسائیں گے

اجلے اجلے کھیتوں میں رنگیں آنچل لہرائیں گے
چرواہے بنسی کی دھن سے گیت فضا میں بوئیں گے
آموں کے جھنڈوں کے نیچے پردیسی دل کھوئیں گے
پینگ بڑھاتی گوری کے ماتھے سے کوندے لپکیں گے
جوہڑ کے ٹھہرے پانی میں تارے آنکھیں جھپکیں گے
الجھی الجھی راہوں میں وہ آنچل تھامے آئیں گے
دھرتی، پھول، آکاش، ستارے سپنا سا بن جائیں گے

کل بھی بوندیں برسی تھیں
کل بھی بادل چھائے تھے
اور کوئی نے سوچا تھا

(۲)

آج بھی بوندیں برسیں گی
آج بھی بادل چھائے ہیں
— اور کوئی اس سوچ میں ہے

بستی پہ بادل چھائے ہیں، پر یہ بستی کس کی ہے؟
دھرتی پر امرت برسے گا، لیکن دھرتی کس کی ہے؟
ہل جوتے گی کھیتوں میں، اَلھڑ ٹولی دہقانوں کی
دھرتی سے پھوٹے گی محنت فاقہ کش انسانوں کی
فصلیں کاٹ کے محنت کش، غلّے کے ڈھیر لگائیں گے
جاگیروں کے مالک آکر سب "پونجی" لے جائیں گے

بوڑھے دہقانوں کے گھر بننے کی فرقی آئے گی
اور قرضے کے سود میں کوئی گوری بیچی جائے گی
آج بھی جنتا بھوکی ہے، اور کل بھی جنتا ترسی تھی
آج بھی رم جھم برکھا ہوگی، کل بھی بارش برسی تھی
آج بھی بادل چھائے ہیں
آج بھی بوندیں برسیں گی
اور کوئی اس سوچ میں ہے

ہراس

تیرے ہونٹوں پہ تبسّم کی وہ ہلکی سی لکیر
میری تخئیل میں رہ رہ کے جھلک اٹھتی ہے
یوں اچانک ترے عارض کا خیال آتا ہے
جیسے ظلمت میں کوئی شمع بھڑک اٹھتی ہے

تیرے پیراہنِ رنگیں کی جنوں خیز مہک
خواب بن بن کے مرے ذہن میں لہراتی ہے
رات کی سرد خموشی میں ہر اک جھونکے سے
تیرے انفاس، ترے جسم کی آنچ آتی ہے

میں سلگتے ہوئے رازوں کو عیاں تو کر دوں
لیکن ان رازوں کی تشہیر سے جی ڈرتا ہے
رات کے خواب اجالے میں بیاں تو کر دوں
ان حسیں خوابوں کی تعبیر سے جی ڈرتا ہے

تیری سانسوں کی تھکن تیری نگاہوں کا سکوت
درحقیقت کوئی رنگین شرارت ہی نہ ہو
میں جسے پیار کا انداز سمجھ بیٹھا ہوں
وہ تبسم، وہ تکلّم تری عادت ہی نہ ہو

سوچتا ہوں کہ تجھے مل کے میں جس سوچ میں ہوں
پہلے اس سوچ کا مقسوم سمجھ لوں تو کہوں
میں ترے شہر میں انجان ہوں پردیسی ہوں
تیرے الطاف کا مفہوم سمجھ لوں تو کہوں

کہیں ایسا نہ ہو پاؤں میرے تھرّا جائیں
اور تری مرمریں باہوں کا سہارا نہ ملے
اشک بہتے رہیں خاموش، سیہ راتوں میں
اور ترے ریشمی آنچل کا کنارا نہ ملے

•

حیات اک مستقل غم کے سوا کچھ بھی نہیں شاید
خوشی بھی یاد آتی ہے، تو آنسو بن کے آتی ہے

اسی دوراہے پر

اب نہ ان اونچے مکانوں میں قدم رکھوں گا
میں نے اک بار یہ پہلے بھی قسم کھائی تھی
اپنی نادار محبّت کی شکستوں کے طفیل
زندگی پہلے بھی شرمائی تھی، جھنجلائی تھی

اور یہ عہد کیا تھا کہ بہ ایں حالِ تباہ
اب کبھی پیار بھرے گیت نہیں گاؤں گا
کسی چلمن نے پکارا بھی تو بڑھ جاؤں گا
کوئی دروازہ کھلا بھی تو پلٹ آؤں گا

پھر ترے کانپتے ہونٹوں کی فسوں کار ہنسی
جال بُننے لگی، بُنتی رہی، بُنتی ہی رہی
میں کھنچا تجھ سے، مگر تو مری راہوں کے لئے
پھول چنتی رہی، چنتی رہی، چنتی ہی رہی

برف برسائی مرے ذہن و تصوّر نے، مگر
دل میں اک شعلۂ بے نام سا لہرا ہی گیا
تیری چپ چاپ نگاہوں کو سلگتے پا کر
میری بیزار طبیعت کو بھی پیار آ ہی گیا

اپنی بدلی ہوئی نظروں کے تقاضے نہ چھپا
میں اس انداز کا مفہوم سمجھ سکتا ہوں
تیرے زرکار دریچوں کی بلندی کی قسم
اپنے اقدام کا مقسوم سمجھ سکتا ہوں

"اب نہ ان اونچے مکانوں میں قدم رکھوں گا"
میں نے اک بار یہ پہلے بھی قسم کھائی تھی
اسی سرمایہ و افلاس کے دوراہے پر
زندگی پہلے بھی شرمائی تھی، جھنجلائی تھی

•

مجھے معلوم ہے انجام رودادِ محبّت کا
مگر کچھ اور تھوڑی دیر سعیِ رائیگاں کرلوں

•

ایک تصویرِ رنگ

میں نے جس وقت تجھے پہلے پہل دیکھا تھا
تو جوانی کا کوئی خواب نظر آئی تھی
حسن کا نغمۂ جاوید ہوئی تھی معلوم
عشق کا جذبۂ بے تاب نظر آئی تھی

اے طرب زارِ جوانی کی پریشاں تتلی
تو بھی اک بوئے گرفتار ہے، معلوم نہ تھا
تیرے جلووں میں بہاریں نظر آتی تھیں مجھے
تو ستم خوردۂ ادبار ہے، معلوم نہ تھا

تیرے نازک سے پروں پر یہ زر و سیم کا بوجھ
تیری پرواز کو آزاد نہ ہونے دے گا
تو نے راحت کی تمنّا میں جو غم پالا ہے
وہ تری روح کو آباد نہ ہونے دے گا

تو نے سرمائے کی چھاؤں میں پنپنے کے لئے
اپنے دل، اپنی محبت کا لہو بیچا ہے
دن کی تزئین فسردہ کا اثاثہ لیکر
شوخ راتوں کی مسرّت کا لہو بیچا ہے

زخم خوردہ ہیں تخیّل کی اڑانیں تیری
تیرے گیتوں میں تری روح کے غم پلتے ہیں
سرمگیں آنکھوں میں یوں حسرتیں لَو دیتی ہیں
جیسے ویران مزاروں پہ دئیے جلتے ہیں

اس سے کیا فائدہ؟ رنگین لبادوں کے تلے
روح جلتی رہے، گھلتی رہے پژمردہ رہے
ہونٹ ہنستے ہوں دکھاوے کے تبسّم کے لئے
دل غمِ زیست سے بوجھل رہے آزردہ رہے

دل کی تسکیں بھی ہے آسائشِ ہستی کی دلیل
زندگی صرف زر و سیم کا پیمانہ نہیں
زیست احساس بھی ہے شوق بھی ہے درد بھی ہے
صرف انفاس کی ترتیب کا افسانہ نہیں

عمر بھر رینگتے رہنے سے کہیں بہتر ہے
ایک لمحہ جو تری روح میں وسعت بھر دے
ایک لمحہ جو ترے گیت کو شوخی دے دے
ایک لمحہ جو تری لے میں مسرّت بھر دے

ایک شام

قمقموں کی زہر اگلتی روشنی — سنگدل، پرہول دیواروں کے سائے
آہنی بُت، دیوپیکر اجنبی — چیختی، چنگھاڑتی خونیں سرائے
— روح الجھی جا رہی ہے کیا کروں؟

چار جانب ارتعاشِ رنگ و نور — چار جانب اجنبی باہوں کے جال
چار جانب خوں فشاں پرچم بلند — میں، مری غیرت، مرا دستِ سوال
— زندگی شرما رہی ہے، کیا کروں؟

کارگاہِ زیست کے ہر موڑ پر روحِ چنگیزی برافگندہ نقاب
تھام! اے صبحِ جہانِ نَو کی ضو جاگ اے مستقبلِ انساں کے خواب
— آس ڈوبی جا رہی ہے، کیا کروں؟

•

موت آ گئی نہ ہو مرے ذوقِ امید کو
محرومیوں میں کیف سا پانے لگا ہوں میں

احساسِ کامراں

افقِ روس سے پھوٹی ہے نئی صبح کی ضَو
شب کا تاریک جگر چاک ہوا جاتا ہے
تیرگی جتنا سنبھلنے کے لیے رکتی ہے
سرخ سیل اور بھی بے باک ہوا جاتا ہے

سامراج اپنے وسیلوں پہ بھروسہ نہ کرے
کہنہ زنجیروں کی جھنکاریں نہیں رہ سکتیں

(سوویٹ فوجوں کے برلن کی سرحد پر پہنچنے پر لکھی گئی)

جذبۂ نصرتِ جمہور کی بڑھتی رو میں
ملک اور قوم کی دیواریں نہیں رہ سکتیں

سنگ و آہن کی چٹانیں ہیں عوامی جذبے
موت کے رینگتے سایوں سے کہو ہٹ جائیں
کروٹیں لے کے مچلنے کو ہے سیلِ انوار
تیرہ و تار گھٹاؤں سے کہو چھٹ جائیں

سالہا سال کے بے چین شراروں کا خروش
اک نئی زیست کا در باز کیا چاہتا ہے
عزمِ آزادئ انساں بہ ہزاراں جبروت
اک نئے دور کا آغاز کیا چاہتا ہے

برتر اقوام کے مغرور خداوں سے کہو
آخری بار ذرا اپنا ترانہ دہرائیں
اور پھر اپنی سیاست پہ پشیماں ہوکر
اپنے ناکام ارادوں کا کفن لے آئیں

سرخ طوفان کی موجوں کو جکڑنے کے لئے
کوئی زنجیرِ گراں کام نہیں آسکتی
رقص کرتی ہوئی کرنوں کے تلاطم کی قسم
عرصۂ دہر پہ اب شام نہیں چھا سکتی

میرے گیت تمہارے ہیں

اب تک میرے گیتوں میں امید بھی تھی پسپائی بھی
موت کے قدموں کی آہٹ بھی، جیون کی انگڑائی بھی
مستقبل کی کرنیں بھی تھیں، حال کی بوجھل ظلمت بھی
طوفانوں کا شور بھی تھا، اور خوابوں کی شہنائی بھی

آج سے میں اپنے گیتوں میں آتش پارے بھر دوں گا
مدھم، لچکیلی تانوں میں جیوٹ دھارے بھر دوں گا

جیون کے اندھیارے پتھ پر مشعل لے کر نکلوں گا
دھرتی کے پھیلے آنچل میں سرخ ستارے بھر دوں گا

آج سے اے مزدور کسانو! میرے راگ تمہارے ہیں
فاقہ کش انسانو! میرے جوگ بہاگ تمہارے ہیں
جب تک تم بھوکے ننگے ہو، یہ شعلے خاموش نہ ہوں گے
جب تک بے آرام ہو تم، یہ نغمے راحت کوش نہ ہوں گے

مجکو اس کا رنج نہیں ہے لوگ مجھے فنکار نہ مانیں
فکر و سخن کے تاجر، میرے شعروں کو اشعار نہ مانیں
میرا فن، میری امیدیں، آج سے تم کو ارپن ہیں
آج سے میرے گیت تمہارے دکھ اور سکھ کا درپن ہیں

تم سے قوت لے کر، اب میں تم کو راہ دکھاؤں گا
تم پرچم لہرانا ساتھی، میں بربط پر گاؤں گا

آج سے میرے فن کا مقصد زنجیریں پگھلانا ہے
آج سے میں شبنم کے بدلے انگارے برساؤں گا

●

اپنی تباہیوں کا مجھے کوئی غم نہیں
تم نے کسی کے ساتھ محبت نبھا تو دی

●

میں نہیں تو کیا؟

مرے لئے یہ تکلّف، یہ دکھ، یہ حسرت کیوں
مری نگاہِ طلب آخری نگاہ نہ تھی
حیات زارِ جہاں کی طویل راہوں میں
ہزار دیدۂ حیراں فسوں بکھیریں گے
ہزار چشمِ تمنّا بنے گی دستِ سوال
نِکل کے خلوتِ غم سے نظر اٹھاؤ تو
وہی شفق ہے، وہی ضَو ہے میں نہیں تو کیا؟

مرے بغیر بھی تم کامیاب عشرت تھیں
مرے بغیر بھی آباد تھے نشاط کدے
مرے بغیر بھی تم نے دئے جلائے ہیں
مرے بغیر بھی دیکھا ہے ظلمتوں کا نزول
مرے نہ ہونے سے امید کا زیاں کیوں ہو
بڑھی چلو مئے عشرت کے جام چھلکاتی
تمہاری سیج، تمہارے بدن کے پھولوں پر
اُسی بہار کا پرتو ہے، میں نہیں تو کیا؟
مرے لئے یہ اداسی، یہ سوگ کیوں آخر
ملیح چہرے پہ گردِ فسردگی کیسی؟
بہارِ غازہ سے عارض کو تازگی بخشو
علیل آنکھوں میں کاجل لگاؤ، رنگ بھرو

سیاہ جوڑے میں کلیوں کی کہکشاں گوندھو

ہزار ہانپتے سینے، ہزار کانپتے لب

تمہاری چشمِ توجہ کے منتظر ہیں ابھی

جلو میں نغمہ و رنگ و بہار و نور لیے

حیات گرمِ تگ و دو ہے، میں نہیں تو کیا؟

خودکشی سے پہلے

اُف یہ بیدرد سیاہی، یہ ہوا کے نوحے
کس کو معلوم ہے اس شب کی سحر ہو کہ نہ ہو
اک نظر تیرے دریچے کی طرف دیکھ تو لوں
ڈوبتی آنکھوں میں پھر تابِ نظر ہو کہ نہ ہو

ابھی روشن ہیں ترے گرم شبستاں کے دِیے
نیلگوں پردوں سے چھنتی ہیں شعاعیں اب تک

اجنبی باہوں کے حلقے میں لچکتی ہوں گی
تیرے مہکے ہوئے بالوں کی ردائیں اب تک

سرد ہوتی ہوئی بتّی کے دھوئیں کے ہمراہ
ہاتھ پھیلائے بڑھے آتے ہیں بوجھل سائے
کون پونچھے مری آنکھوں کے سلگتے آنسو
کون الجھے ہوئے بالوں کی گرہ سلجھائے

آہ یہ غارِ ہلاکت، یہ دئیے کا مجلس
عمر اپنی انہی تاریک مکانوں میں کٹی
زندگی فطرتِ بے حِس کی پرانی تقصیر
اک حقیقت تھی مگر چند فسانوں میں کٹی

کتنی آسائشیں ہنستی رہیں ایوانوں میں
کتنے در میری جوانی پہ سدا بند رہے
کتنے ہاتھوں نے بُنا اطلس و کمخواب مگر
میرے ملبوس کی تقدیر میں پیوند رہے

ظلم سہتے ہوئے انسانوں کے اس مقتل میں
کوئی فردا کے تصوّر سے کہاں تک بہلے
عمر بھر رینگتے رہنے کی سزا ہے جینا
ایک دو دن کی اذیت ہو تو کوئی سہہ لے

وہی ظلمت ہے فضاؤں پہ ابھی تک طاری
جانے کب ختم ہو انسان کے لہو کی تقطیر

جانے کب نکھرے سیہ پوش فضا کا جوبن
جانے کب جاگے ستم خوردہ بشر کی تقدیر

ابھی روشن ہیں ترے گرم شبستاں کے دیئے
آج میں موت کے غاروں میں اتر جاؤں گا
اور دم توڑتی بتّی کے دھوئیں کے ہمراہ
سرحدِ مرگِ مسلسل سے گذر جاؤں گا

پھر وہی کنجِ قفس .....

چند لمحوں کے لئے شور اٹھا، ڈوب گیا
کہنہ زنجیرِ غلامی کی گرہ کٹ نہ سکی
پھر وہی سیلِ بلا ہے، وہی دامِ امواج
ناخداؤں میں سفینے کی جگہ بٹ نہ سکی

ٹوٹتے دیکھ کے دیرینہ تعطل کا فسوں
نبضِ امیدِ وطن اُبھری، مگر ڈوب گئی

پیشواؤں کی نگاہوں میں تذبذب پا کر
ٹوٹتی رات کے سائے میں سحر ڈوب گئی

میرے محبوب وطن! تیرے مقدر کے خدا
دستِ اغیار میں قسمت کی عناں چھوڑ گئے
اپنی یک طرفہ سیاست کے تقاضوں کے طفیل
ایک بار اور تجھے نوحہ کناں چھوڑ گئے

پھر وہی گوشۂ زنداں ہے وہی تاریکی
پھر وہی کہنہ سلاسل، وہی خونیں جھنکار
پھر وہی بھوک سے انساں کی ستیزہ کاری
پھر وہی ماؤں کے نوحے وہی بچوں کی پکار

تیرے رہبر تجھے مرنے کے لیئے چھوڑ چلے
ارضِ بنگال! انہیں ڈوبتی سانسوں سے پکار
بول چپٹ گاؤں کی مظلوم خموشی کچھ بول!
بول اے پیپ سے رِستے ہوئے سینوں کی بہار
بھوک اور قحط کے طوفان بڑھے آتے ہیں
بول اے عصمت و عفت کے جنازوں کی قطار
روک ان لوٹتے قدموں کو، انہیں پوچھ ذرا
پوچھ اے بھوک سے دم توڑتے ڈھانچوں کی قطار

زندگی جبر کے سانچوں میں ڈھلے گی کب تک؟
ان فضاؤں میں ابھی موت پلے گی کب تک؟

(شملہ کانفرنس کی ناکامی پر لکھی گئی)

اشعار

نفس کے لوچ میں رم ہی نہیں، کچھ اور بھی ہے
حیات، ساغرِ سم ہی نہیں، کچھ اور بھی ہے
تری نگاہ مرے غم کی پاسدار سہی
مری نگاہ میں غم ہی نہیں، کچھ اور بھی ہے
مری ندیم! محبت کی رفعتوں سے نہ گر
بلند، بامِ حرم ہی نہیں، کچھ اور بھی ہے

یہ اجتناب ہے عکسِ شعورِ محبوبی،
یہ احتیاط، ستم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے
اِدھر بھی ایک اچٹتی نظر، کہ دنیا میں
فروغِ محفلِ جسم ہی نہیں، کچھ اور بھی ہے
نئے جہان بسائے ہیں فکرِ آدم نے
اب اس زمیں پہ ارم ہی نہیں، کچھ اور بھی ہے
مرے شعور کو آوارہ کر دیا جس نے
وہ مرگِ شادی و غم ہی نہیں، کچھ اور بھی ہے

نور جہاں کے مزار پر

پہلوئے شاہ میں یہ دخترِ جمہور کی قبر
کتنے گم گشتہ فسانوں کا پتہ دیتی ہے
کتنے خونریز حقائق سے اٹھاتی ہے نقاب
کتنی کچلی ہوئی جانوں کا پتہ دیتی ہے

کیسے مغرور شہنشاہوں کی تسکیں کے لئے
سالہا سال حسیناؤں کے بازار لگے

کیسے بہکی ہوئی نظروں کے تعیّش کے لئے
سرخ محلوں میں جواں جسموں کے انبار لگے

کیسے ہر شاخ سے منہ بند، مہکتی کلیاں
نوچ لی جاتی تھیں تزئینِ حرم کی خاطر
اور مُرجھا کے بھی آزاد نہ ہو سکتی تھیں
ظلِّ سبحان کی الفت کے بھرم کی خاطر

کیسے اک فرد کے ہونٹوں کی ذرا سی جنبش
سرد کر سکتی تھی بے لوث وفاؤں کے چراغ
لوٹ سکتی تھی دمکتے ہوئے ماتھوں کا سہاگ
توڑ سکتی تھی مئے عشق سے لبریز ایاغ

سہمی سہمی سی فضاؤں میں یہ ویراں مرقد
اتنا خاموش ہے، فریاد کناں ہو جیسے

سرد شاخوں میں ہوا چیخ رہی ہے ایسے

روحِ تقدیس و وفا مرثیہ خواں ہو جیسے

تُو مری جان! مجھے حیرت و حسرت سے نہ دیکھ

ہم میں کوئی بھی جہاں نور و جہاں گیر نہیں

تو مجھے چھوڑ کے، ٹھکرا کے بھی جا سکتی ہے

تیرے ہاتھوں میں مرے ہاتھ ہیں زنجیر نہیں

پھر اُسی وادیٔ شاداب میں لوٹ آیا ہوں
جس میں پنہاں مرے خوابوں کی طرب گاہیں ہیں
میرے احباب کے سامانِ تعیّش کے لئے
شوخ سینے ہیں، جواں جسم حسیں باہیں ہیں

سبز کھیتوں میں یہ دبکی ہوئی دوشیزائیں
ان کی شریانوں میں کس کس کا لہو جاری ہے

کس میں جرأت ہے کہ اس راز کی تشہیر کرے
سب کے لب پر مری ہیبت کا فسوں طاری ہے

ہائے وہ گرم و دلآویز اُبلتے سینے
جن سے ہم سطوتِ آبا کا صلہ لیتے ہیں
جانے ان مرمریں جسموں کو یہ مریل دہقاں
کیسے ان تیرہ گھروندوں میں جنم دیتے ہیں

یہ لہکتے ہوئے پودے، یہ دمکتے ہوئے کھیت
پہلے اجداد کی جاگیر تھے اب میرے ہیں
یہ چراگاہ، یہ ریوڑ، یہ مویشی، یہ کسان
سب کے سب میرے ہیں، سب میرے ہیں، سب میرے ہیں

ان کی محنت بھی مری، حاصلِ محنت بھی مرا
ان کے بازو بھی مرے، قوتِ بازو بھی مری
میں خداوند ہوں اس وسعتِ بے پایاں کا
موجِ عارض بھی مری، نکہتِ گیسو بھی مری

میں اُن اجداد کا بیٹا ہوں جنہوں نے پیہم،
اجنبی قوم کے سائے کی حمایت کی ہے
غدر کی ساعتِ ناپاک سے لیکر اب تک
ہر کڑے وقت میں سرکار کی خدمت کی ہے

خاک پر رینگنے والے یہ فسردہ ڈھانچے
ان کی نظریں کبھی تلوار بنی ہیں نہ بنیں

ان کی غیرت پہ ہر اک ہاتھ جھپٹ سکتا ہے
ان کے ابرو کی کمانیں نہ تنی ہیں نہ تنیں

ہائے یہ شام، یہ جھرنے، یہ شفق کی لالی
میں ان آسودہ فضاؤں میں ذرا جھوم نہ لوں
وہ دبے پاؤں ادھر کون چلی جاتی ہے
بڑھ کے اس شوخ کے ترشے ہوئے لب چوم نہ لوں

مادام

آپ بے وجہ پریشان سی کیوں ہیں مادام!
لوگ کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہوں گے
میرے احباب نے تہذیب نہ سیکھی ہو گی
میرے ماحول میں انسان نہ رہتے ہوں گے

نورِ سرمایہ سے ہے روئے تمدّن کی جِلا
ہم جہاں ہیں، وہاں تہذیب نہیں پل سکتی

مفلسی حسِّ لطافت کو مٹا دیتی ہے
بھوک، آداب کے سانچوں میں نہیں ڈھل سکتی

لوگ کہتے ہیں تو لوگوں پہ تعجّب کیسا؟
سچ تو کہتے ہیں کہ ناداروں کی عزّت کیسی
لوگ کہتے ہیں ــــ مگر آپ ابھی تک چپ ہیں
آپ بھی کہیے غریبوں میں شرافت کیسی

نیک مادام! بہت جلد وہ دَور آئے گا
جب ہمیں زیست کے ادوار پرکھنے ہوں گے
اپنی ذلّت کی قسم، آپ کی عظمت کی قسم
ہم کو تعظیم کے معیار پرکھنے ہوں گے

ہم نے ہر دَور میں تذلیل سہی ہے، لیکن
ہم نے ہر دَور کے چہرے کو ضیا بخشی ہے
ہم نے ہر دَور میں محنت کے ستم جھیلے ہیں
ہم نے ہر دَور کے ہاتھوں کو حنا بخشی ہے

لیکن ان تلخ مباحث سے بھلا کیا حاصل؟
لوگ کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہوں گے
میرے احباب نے تہذیب نہ سیکھی ہو گی
میں جہاں ہوں، وہاں انسان نہ رہتے ہوں گے

مفاہمت

نشیبِ ارض پہ ذرّوں کو مشتعل پاکر
بلندیوں پہ سفید اور سیاہ مل ہی گئے
جو یادگار تھے باہم ستیزہ کاری کی
بہ فیضِ وقت وہ دامن کے چاک سل ہی گئے

جہاد ختم ہؤا، دورِ آشتی آیا
سنبھل کے بیٹھ گئے محملوں میں دیوانے
ہجومِ تشنہ لباں کی نگاہ سے اوجھل
چھلک رہے ہیں شرابِ نفس کے پیمانے

یہ جشن، جشنِ مسرّت نہیں، تماشا ہے
نئے لباس میں نکلا ہے رہزنی کا جلوس
ہزار شمعِ اخوت بجھا کے چمکے ہیں
یہ تیرگی کے ابھارے ہوئے حسیں فانوس

یہ شاخِ نور جسے ظلمتوں نے سینچا ہے
اگر پھلی، تو شراروں کے پھول لائے گی
نہ پھل سکی تو نئی فصلِ گل کے آنے تک
ضمیرِ ارض میں اک زہر چھوڑ جائے گی

بمبئی۔ پندرہ اگست

"جشنِ آزادی"

آج

ساتھیو! میں نے برسوں تمہارے لئے
چاند، تاروں، بہاروں کے سپنے بُنے
حسن اور عشق کے گیت گاتا رہا
آرزوؤں کے ایواں سجاتا رہا
میں تمہارا مغنّی، تمہارے لئے
جب بھی آیا نئے گیت لاتا رہا

آج لیکن میرے دامنِ چاک میں

گردِ راہِ سفر کے سوا کچھ نہیں

میرے بربط کے سینے میں نغموں کا دم گھٹ گیا ہے

تانیں چیخوں کے انبار میں دب گئی ہیں

اور گیتوں کے سُر ہچکیاں بن گئے ہیں

میں تمہارا مغنّی ہوں، نغمہ نہیں ہوں

اور نغمے کی تخلیق کا ساز و ساماں

ساتھیو! آج تم نے بھسم کر دیا ہے

اور میں — اپنا ٹوٹا ہؤا ساز تھامے

سرد لاشوں کے انبار کو تک رہا ہوں

میرے چاروں طرف موت کی وحشتیں ناچتی ہیں

اور انساں کی حیوانیت جاگ اٹھی ہے

بربریت کے خونخوار عفریت
اپنے ناپاک جبڑوں کو کھولے

خون پی پی کے غرّا رہے ہیں
بچے ماؤں کی گودوں میں سہمے ہوئے ہیں

عصمتیں سر برہنہ پریشان ہیں
ہر طرف شورِ آہ و بُکا ہے

اور میں اس تباہی کے طوفان میں
آگ اور خوں کے ہیجان میں

سرنگوں اور شکستہ مکانوں کے ملبے سے پُر راستوں پر
اپنے نغموں کی جھولی پسارے

در بدر پھر رہا ہوں ——
مجکو امن اور تہذیب کی بھیک دو،

میرے گیتوں کی لے، میرے سُر، میری نَے
میرے مجروح ہونٹوں کو پھر سونپ دو

ساتھیو! میں نے برسوں تمہارے لئے
انقلاب اور بغاوت کے نغمے الاپے
اجنبی راج کے ظلم کی چھاؤں میں
سر فروشی کے خوابیدہ جذبے ابھارے
اور اس صبح کی راہ دیکھی
جس میں اس ملک کی روح آزاد ہو

آج زنجیرِ محکومیت کٹ چکی ہے
اور اس ملک کے بحر و بر، بام و در
اجنبی قوم کے ظلمت افشاں پھریرے کی منحوس چھاؤں سے آزاد ہیں
کھیت سونا اگلنے کو بے چین ہیں

وادیاں لہلہانے کو بیتاب ہیں
کوہساروں کے سینے میں ہیجان ہے
سنگ اور خشت بے خواب و بیدار ہیں
ان کی آنکھوں میں تعمیر کے خواب ہیں
ان کے خوابوں کو تکمیل کا روپ دو
ملک کی وادیاں، گھاٹیاں، کھیتیاں
عورتیں، بچّیاں —
ہاتھ پھیلائے خیرات کی منتظر ہیں
ان کو امن اور تہذیب کی بھیک دو
ماؤں کو اُن کے ہونٹوں کی شادابیاں
ننھّے بچّوں کو اُن کی خوشی بخش دو
ملک کی روح کو زندگی بخش دو

مجکو میرا ہنر، میری لے بخش دو
میرے سُر بخش دو، میری نے بخش دو
آج ساری فضا ہے بھکاری
اور میں اس بھکاری فضا میں
اپنے نغموں کی جھولی پسارے
در بدر پھر رہا ہوں،
مجکو پھر میرا کھویا ہوا ساز دو
میں تمہارا مغنّی — تمہارے لئے
جب بھی آیا، نئے گیت لاتا رہوں گا

(اے۔ آئی۔ آر) دہلی

۱۱ر ستمبر ۴۷ء